بے شناخت

ناصر بغدادی

بے شناخت

(منتخب افسانے)

ناصر بغدادی

ندا پبلی کیشنز، کراچی

اشاعتِ اوّل	۱۹۹۰ء
ایڈیشن	آفسٹ
نام کتاب	بے شناخت
مصنف	ناصر بغدادی
سرِورق	انور انصاری
کتابت	مشتاق احمد
ناشر	ندا پبلی کیشنز، ای ۲، ۸/۱۴، معمار اسکوئر گلشنِ اقبال، کراچی ۷۴۸۰۰
مطبع	مشہور آفسٹ پریس، کراچی
تعداد	ایک ہزار
قیمت	۷۵ روپے

اُستادِ محترم
محمد حسن عسکری (مرحوم)
کی یاد میں

I DO NOT KNOW WHAT I MAY APPEAR TO THE WORLD, BUT TO MYSELF I SEEM TO HAVE BEEN ONLY LIKE A BOY PLAYING ON THE SEA-SHORE, AND DIVERTING MYSELF IN NOW AND THEN FINDING A SMOOTHER PEBBLE OR A PRETTIER SHELL THAN ORDINARY, WHILST THE GREAT OCEAN OF TRUTH LAY ALL UNDISCOVERED BEFORE ME.

SIR ISAAC NEWTON

ترتیب

ابد کا تنہا سفر

جو کچھ وہ اس وقت دیکھ رہا تھا کیا وہ خواب نہ تھا؟ اگر نہیں تو یقیناً یہ حقیقت خواب سے کہیں زیادہ پُر اسرار تھی۔ بڑی ہی ڈراؤنی اور بھیانک! اس نے محسوس کیا جیسے دیکھنے اور محسوس کرنے کی قوت کے علاوہ اس کا وجود ہر نوع کی طاقت اور صلاحیت سے یکسر محروم ہو گیا ہو! اس کا جسم ساکت و صامت تھا جیسے کلّی طور پر مفلوج ہو گیا ہو۔ اس نے بارہا اپنے بدن کو متحرک کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ اپنی انگلی تک ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا!!

یہ اس کا اپنا کمرہ تھا جہاں یہ واقعہ پُر اسرار ڈرامہ بن کر پیش آ رہا تھا۔ کمرے میں کسی خاص ردّ و بدل کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی۔ صرف اس کی مسہری کو دریچے کے قریب سے ہٹا کر کمرے کے بیچوں بیچ لے آیا گیا تھا اور یہی ایک تبدیلی تھی جس کو اس نے آنکھ کھلنے کے بعد اپنی پوری جزئیات کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ عام حالات میں شاید وہ اس تبدیلی پر اپنے بھرپور غیظ و غضب کا عملی مظاہرہ کرتا مگر کمرے میں پیش آنے والے منظر کو دیکھ کر وہ کسی دوسرے ہی ردّ عمل کے لئے خود کو تیار محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا پہلا ردّ عمل تو یہی تھا کہ شاید گھر والوں نے اس کو کسی عملی مذاق کا ہدف بنایا ہو۔ یہ مذاق ہی تو تھا کہ اس کی ماں بہنیں اور دوسرے رشتے دار بلا کسی وجہ اس سے لپٹ لپٹ کر آنسوؤں کا طوفان بہا رہے تھے۔ مگر وہ آواز بالکل نہیں سن سکا۔ یہ خواب جیسا منظر تھا جس میں کہنے والے کے ہلتے ہوئے لب کو دیکھ کر محسوس تو کیا جا سکتا

ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، مگر اس کی آواز سنائی نہیں دیتی! تو کیا وہ خواب دیکھ رہا تھا؟ ایک بھیانک خواب جس میں وہ مر چکا تھا اور اس کے عزیز و اقارب اس کی موت پر ماتم میں مصروف تھے، مگر نہیں نہیں وہ زندہ تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا۔ اس کا ذہن خیالات کی پُر پیچ گتھیوں کو سلجھانے میں ہمہ تن منہمک تھا اور سوچ ہی انسان کے زندہ رہنے کی پہلی علامت ہے! جب تک ذہن سوچتا ہے انسان کی موت واقع نہیں ہو سکتی!!

اس نے ہلنے جلنے کی کوشش کی مگر اس کا جسم تو جیسے پتّھر کے مجسمہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخنے کی کوشش کی مگر اس بار بھی وہ ناکام ہی رہا۔ آواز تو جیسے برف کی قاش بن کر حلق میں منجمد ہو گئی تھی! غصّہ کے جلتے ہوئے جذبات نے اس کی حالت بری کر دی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس ماتمی ہجوم کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔ مگر وہ اس سچویشن میں بھی نہ تھا کہ اپنا غصّہ اپنے ہی پر اتار سکتا! نہ معلوم مقدر نے اس کیلئے کیسے حالات پیدا کر دیئے تھے۔ اس کی ساری عملی قوتیں مستعفی ہو کر رہ گئی تھیں۔ اگر وہ مر چکا تھا تو یقیناً اس کے لئے موت ایک بے درد حقیقت کا نام تھی۔ اور اگر اس کا شمار ہنوز زندوں میں تھا تو بلا مبالغہ زندگی سارے معانی و مفاہیم سے یکسر معرّا تھی ـــــ بے چارگی اور بے بسی جب نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تو اس کا جی چاہا کہ وہ بھی ماتم کرنے والوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ سوچ کے اس موڑ پر پہنچ کر اس کے ذہن کے تاریک سرنگ میں ایک خیال بجلی بن کر چمکا۔

"آنسو ـــ یقیناً مجھے آنسو بہانا چاہیئے۔ ممکن ہے میری آبدیدگی کا نظارہ میری زندگی کا ثبوت فراہم کر دے۔" اور پھر اس نے اپنی ساری طاقت کے ساتھ آنسوؤں کے چند زندہ قطروں کو آنکھوں سے خارج کرنے کی کوشش میں زمین و آسمان ایک کر دیئے۔ مگر اس کی آنکھیں تو پتھرا چکی تھیں۔ پتلیاں ایک جگہ ٹھہر چکی تھیں!!

"تو کیا وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ پراسرار نظارہ دیکھ رہا تھا؟" ایک خوفناک خیال نے خطرناک افعی کی طرح ذہن کے کونے سے سر ابھارا۔ اس کی خوفزدگی ہزار چند ہو گئی۔ شاید اس کا خیال درست تھا کیوں کہ وہ صرف ایک سمت دیکھ سکتا تھا۔ اگر آنکھیں گھوم سکتیں تو

وہ لیٹے لیٹے بھی سارے کمرے کے دائیں بائیں طرف بآسانی دیکھ لیتا۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ وہ تو صرف ناک کی سیدھ ہی میں دیکھ سکتا تھا۔ اور اس کی دونوں آنکھیں ایک جگہ جم کے رہ گئی تھیں!!

"مگر کیا مردہ آنکھیں زندگی کا نظارہ کر سکتی ہیں؟" ایک اور پراسرار خیال ابھرا۔ مگر وہ اس وقت اس حالت میں نہ تھا کہ ان غیر منطقی حالات کی کوکھ سے پیدا شدہ مابعد الطبیعاتی قسم کے واقعات کو منطقی استدلال کی ترازو میں تول سکتا!!

اس نے پھر محسوس کیا جیسے اس کا ذہن آہستہ آہستہ کہر آلود سیاہیوں میں ڈوبتا جا رہا ہو۔ شاید اس کی زندگی مکمل طور پر فنا ہو رہی تھی یا اس کی ادھوری موت تکمیل کے آخری مرحلہ میں ہو گئی تھی۔ ماتمی چہروں کی جھلکیاں دھیرے دھیرے معدوم ہو رہی تھیں۔ اور ہر منظر یوں ڈوب رہا تھا جیسے شام کا سورج سارے دن کا سفر مکمل کر کے افق کی گہری قبر میں اترتا جاتا ہے۔ اس کی نیند گہری ہوتی گئی اور نہ معلوم کب تک اس کا ذہن دھند کی چادر اوڑھے سوتا رہا!

اس بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سامنے ایک دوسرا ہی منظر تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک نیم تاریک کوٹھری میں سیلی ہوئی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ اس کا متحرک جسم اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ہنوز زندہ ہے۔ اس کی آنکھیں ایک زندہ انسان کی آنکھیں تھیں کیوں کہ وہ ہر سمت گردش کر رہی تھیں۔ وہ سن بھی سکتا تھا کیوں کہ دور سے دریا کے بہنے کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی اور یقیناً وہ بول بھی سکتا تھا کیونکہ چند لمحے قبل اس کے منہ سے کوئی بے معنی اور بے ربط سی بات پھسل پڑی تھی۔ مگر اس وقت وہ کہاں تھا؟ یہ کون سی جگہ تھی؟ یہاں اسے کون لے آیا تھا؟ اس نے محسوس کیا کہ خوف کی شدت سے وہ لرزہ براندام ہے۔ وہ شاید بے تحاشا تھکا ہوا بھی تھا کیونکہ اس کا بار بار لیٹ جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر اس نے لیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی شائد اس ڈر سے کہ کہیں لیٹنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے لیٹ ہی نہ جائے!!

یہ بڑی عجیب سی اجنبی جگہ تھی کوٹھری نما کمرہ ہر طرح کے فرنیچر سے خالی تھا۔ دیواروں

پر مکڑیوں کے جالے پڑے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی بدبو کا سر کو چکرانے والا جھونکا روشن دان کی راہ سے آکر اس کے چہرے کی طرف لپک جاتا۔ اس کے عین سامنے ایک بوسیدہ سا دروازہ تھا جس سے بمشکل ایک آدمی داخل ہو سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ آگے بڑھ کر ایک ٹھوکر سے اس دروازہ کو چوکھٹ سمیت اکھاڑ پھینکے۔ وہ دراصل باہر نکل کر اس جگہ کی جغرافیہ سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے وہ اٹھا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ اس کا ذہن پھر تذبذب کا شکار ہو گیا۔ مسلسل مافوق الفطرت واقعات نے اس کی قوتِ عمل کو بے حد کمزور کر دیا تھا۔ اُنہونی باتوں کا چکر یوں چل رہا تھا کہ ہر کام کے کرنے سے قبل وہ اس کے متوقع منفی نتائج پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ خود اعتمادی نام کی جو چیز ہوتی ہے وہ اس سے محروم ہوتا جا رہا ہے!!

اس نے ایک لمحہ کے لئے بغور دروازے کو دیکھا۔ دروازہ اس قدر گندہ تھا کہ گندگی خود ایک نیا رنگ بن کر اس پر پھیلی ہوئی تھی۔ شاید وہ مدتوں سے انسانی ہاتھوں کی حرارت آمیز لمسوں سے محروم رہا تھا۔ اس وقت اس کے نزدیک یہ دروازہ ہی اس کی نجات کا آخری ذریعہ تھا۔ اچانک اس کی افتادگی و بے چارگی پر اُمید کا گلابی رنگ پھیل گیا۔ اس نے محسوس کیا اس کی مصیبت کے اذیت ناک دن پورے ہو چکے ہیں اور یہ کہ اس حبس بے جا سے اس کی رہائی زیادہ دور نہیں!!

وہ آہستہ آہستہ کامل اعتماد کو ہم رکاب لئے دروازے کی طرف بڑھا اور دوسرے ہی لمحے اس کی بھرپور ٹھوکر دروازے پر لگ چکی تھی۔ لیکن اچانک اس کا سر بری طرح چکرا کر رہ گیا۔ وہ کراہ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور جلدی سے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ شاید وہ ایسا نہ کرتا تو دھڑام سے گر ہی پڑتا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس ٹھکانے پر آئے تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا پاؤں بے پایاں درد کی شدت سے جھنجھنا رہا ہے۔ جس دروازے کو وہ اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھا اس نے جیسے پلٹ کر اسے ٹھوکر مار دی تھی — اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ آہنی دروازہ ہے۔ کیونکہ ٹھوکر لگنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی وہ ایسی ہی تھی جیسے کسی نے

فولادی پلیٹ پر چوٹ لگادی ہو۔ وہ نہ معلوم کتنی دیر تک درد سے بلبلاتا ہوا بے چارگی کے احساسات لئے وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ نہ معلوم کون اس کے ساتھ موت اور زندگی کا یہ بے رحم کھیل کھیل رہا تھا!

وہ قبر نما چھوٹا سا کمرہ سرمئی تاریکیوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ نہ معلوم کائنات کا یہ کون سا حصہ تھا جہاں شام زندگی کی طرح ڈھلتی جا رہی تھی۔ اب دریا کے بہنے کی آواز اسے بے حد قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ گہرے دبیز سناٹے میں یہ آواز بے حد پر اسرار اور ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے خوفناک درندے آپس میں لڑ رہے ہوں۔ اس کے زخمی پاؤں کا درد اب آخری وقت کے درد سے مختلف نہ تھا۔

اچانک ٹھن ٹھن کی آوازوں سے وہ بری طرح چونکا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی لوہے پر ہتھوڑا چلا رہا ہو۔ یقیناً کوئی باہر تھا اور آہنی دروازے کو کھولنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جس میں امید کے پہلو میں خوف دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ نہ معلوم باہر کون تھا اور اس کے لئے کیا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں سر میں دھمک پیدا کرنے لگیں۔ وہ خوف سے ہم آغوش مختلف نوع کی آوازیں سنتا رہا۔ دروازہ یقیناً عرصہ دراز سے مقفل رہا ہوگا اور شائد زنگ خوردگی کی وجہ سے باہر کھڑے شخص کو اپنی بھرپور طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا۔ بہرحال چند لمحوں بعد دروازہ بڑی ہی کریہہ آواز سے یوں آہستہ آہستہ کھلا جیسے کسی حنوط شدہ لاش میں ہلچل پیدا ہو گئی ہو۔ وہ چپ چاپ سیلی ہوئی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا آنے والے حادثے کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ آس پاس میں ایسی عجیب سی خوشبوئیں پھیل رہی تھیں جن سے اُس کے محسوسات کا پہلے کبھی ٹکراؤ نہ ہوا تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ دھوئیں کے گہرے مرغولوں سے وہ چھوٹا سا کمرہ بھرتا گیا۔ نہ معلوم یہ خوشبوؤں کا اثر تھا یا دھوئیں کی موجودگی کہ اس کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹتا جا رہا ہو! اس نے گھبرا کر اپنی گردن کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولا مگر وہ تو ہر قسم کی گرفت سے آزاد تھی ـــــ یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ کیا وہ آہستہ آہستہ مرتا جا رہا تھا یا اس کی زندگی ہی نے مرگِ مسلسل کا روپ اختیار کر لیا تھا؟

اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے قریب ہی کوئی موجود ہے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھوئیں کے پار دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا لیکن اس کی چھٹی حس اس کو واہمہ تصور کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ یقیناً وہاں کوئی موجود تھا اور اس کی حرکات کا بہ نظر غائر جائزہ لے رہا تھا۔ اگر وہاں کوئی موجود نہ تھا تو یہ دروازہ از خود کیسے کھل سکتا تھا؟ ان طلسمی واقعات کی گاڑی کو چلانے والا جادوگر پس منظر میں بیٹھا اس سے کسی قسم کا مذاق کر رہا تھا؟ اس نے پھر دروازے کی طرف دیکھا مگر دھوئیں کی کثرت کے سبب وہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ نہ معلوم یہ اس کا واہمہ تھا یا حقیقت کہ اس نے اپنے عین سامنے دھوئیں کے اندر دو شعلوں کو دہکتے ہوئے دیکھا۔

"کیا یہاں کوئی ہے؟" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور تب اسے احساس ہوا کہ اس کے جسم کی ساری توانائی دوبارہ رخصت ہو گئی ہے۔ جیسے اس کا جسم ایک جگہ اکڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ مجسمہ کی شکل میں بیٹھا یک ٹک دو شعلوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک چند ہلکی ہلکی سرسراہٹیں ابھریں۔ اس نے محسوس کیا کہ ان دو شعلوں کی آگ کچھ اور تیز ہو گئی ہے۔

"کیا تمہیں اپنا نیا گھر پسند آیا؟" بڑی پُر اسرار اور غیر مانوس سی آواز بازگشت بن کر ابھری۔ اس کے رونگٹے کچھ اور کھڑے ہو گئے۔

"کون ہو تم؟" یہ اس کے اکڑے ہوئے جسم کی پکار تھی۔

"اس بات کے جاننے کی تمہیں ضرورت نہیں۔" آواز بڑی عجیب تھی۔ ایک لمحہ کے سناٹے کے بعد آواز نے پھر اپنا پچھلا سوال دہرایا۔ "کیا تمہیں اپنا نیا گھر پسند آیا؟"

"کون سا گھر میرے دوست؟"

"جہاں تم اس وقت موجود ہو؟"

"مگر میں یہاں کیوں ہوں؟"

"موت کے بعد ہر ایک کو آخری آرام گاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس نے ان دو شعلوں کی تپش کو اپنے اکڑے ہوئے جسم کے ہر حصے میں محسوس کیا۔ لہجہ کچھ ایسا تھا کہ ایک

لمحہ کے لئے وہ حواس باختہ ہو گیا۔

"موت ـــــ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بوکھلا گیا۔ "نہیں نہیں میں ابھی زندہ ہوں۔"

"تم اپنی آنکھوں سے اپنی موت کا نظارہ دیکھ چکے ہو۔" آواز بڑی گمبھیر تھی۔

"نہیں، نہیں۔ وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔"

"موت خود ایک ڈراؤنا خواب ہے، اور یہ خواب ابد تک قائم رہتا ہے۔"

"میرے دوست مجھے یہاں سے نکالو" اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "اس تہہ خانہ میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔" جواب میں کوئی ہنسا۔ ایسی ہنسی جو موت سے کم بھیانک نہ تھی۔

"یہ تہہ خانہ نہیں تمہاری قبر ہے۔" آواز نے کہا، "تمہارے رشتے دار تمہیں دفن کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔"

"میں زندہ ہوں۔" وہ بے جان آواز میں بولا۔ "اور مجھے یہ نہیں معلوم کہ مجھے یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے۔"

"زندہ رہنے کی سزا موت ہے۔" آواز بارعب تھی۔ "اور ہر زندہ رہنے والے کو یہ سزا ابد تک کاٹنی پڑتی ہے۔" اس نے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز جیسے اس کے حلق سے باہر نہ آسکی۔

"اچھا میرے دوست!" آواز دوبارہ ابھری۔ "اب میرے جانے کا وقت ہو گیا۔ مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ میں تمہاری اس نئی زندگی کے لئے بہترین خواہشات چھوڑے جا رہا ہوں۔"

"نئی زندگی؟..." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہاں! موت ایک نئی زندگی کا نام ہے جس کا سفر ابد تک جاری رہتا ہے۔" اور پھر اچانک ان دو دہکتے ہوئے شعلوں کی آگ دھیمی ہونے لگی اور پھر چند لمحوں بعد جس مقام پر دو شعلے دہک رہے تھے، اب وہاں تاریکی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ دھوئیں کے بادل جو کچھ دیر قبل تک اطراف میں منڈلا رہے تھے اب ان کو بھی جیسے دبیز اندھیروں نے نگل لیا تھا۔ وہ پُراسرار خوشبو جو تھوڑی دیر پہلے تک اس کے

محسوسات پر طاری تھی اب وہ بھی معدوم ہو گئی تھی —— اس نے ایک گھن گرج آواز سنی شاید آہنی دروازہ مقفل کر دیا گیا تھا! مگر وہ ارد گرد کچھ نہ دیکھ سکا —— کمرے کا اکلوتا روشن دان بھی یوں غائب ہو گیا تھا جیسے سرے سے وہاں موجود ہی نہ تھا۔ اس نے اٹھنے کی بھرپور کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا۔ اس نے آس پاس دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دیا۔ اس کی ہر حس پر جیسے گہری نیند کی دھند پھیلتی جا رہی تھی —— شاید ابد کا طویل اور تنہا سفر اسی لمحے شروع ہو چکا تھا!!

اذان

وہ چھوٹا سا کمرہ قبر نما تھا!

اور اگر ایمانداری سے کہا جائے تو یقیناً قبر اس سے زیادہ آرام دہ اور پُرسکون ہو گی۔ قبر میں کم از کم کفن پوش مردے کو وحشت، گھٹن اور حبس کا احساس تو نہیں ہوتا ہے۔ وہ طمانیت سے ابدی نیند کے مزے لوٹتا ہے۔ مگر اس کمرے کی آسیبی اور زہریلی فضا میں اگر کوئی اجنبی سانس لینے کی کوشش کرتا تو بھی وہ اپنی اس کوشش میں بار آور نہ ہو سکتا اور دم گھٹ کر مر جاتا۔ وہاں کی مسموم اور بس بھری فضائیں وہی زندہ رہ سکتا تھا جو کاربن ڈائی آکسائڈ لینے کا عادی ہوتا! اور اس وقت بھی چند ایسے لوگ وہاں موجود تھے۔ گرمی، حبس اور پسینے کی فراوانی سے ان کی حالتیں غیر ہو رہی تھیں مگر اس کے باوجود انہیں اس کا احساس نہ تھا۔

غلام کے میلے کپڑے پسینے کی وجہ سے اس کے آبنوس کی لکڑی کی طرح سیاہ جسم سے جونک کی طرح چمٹ گئے تھے۔ میلاہٹ اور کثافت کی وجہ سے ہلکی ہلکی بدبو کی لہریں فضا میں منتشر ہو رہی تھیں۔ مگر وہاں کس کو اتنی فرصت تھی کہ اس بدبو کو محسوس کر کے ناک پر ہاتھ رکھ لیتا یا کسمسا کر پہلو بدل کر بُرا سا منہ بناتا! اس کے برابر بیٹھا ہوا اللہ رکھا اپنے بدبودار رومال سے یوں تو بار بار چہرے سے پسینہ پونچھ رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ بے چین اور متوحش معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ صرف ایک بار اس نے آہستہ سے کہا تھا۔

"بڑی کالی گرمی ہے رے!"

اور حمدو اور اللہ داد کے چہرے جذبات سے عاری تھے۔ بیقراری کے آثار سے ان کی آنکھیں

منبر اٹھیں۔ وہ یوں پُرسکون دکھائی دے رہے تھے جیسے اس وقت وہ ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے ہوئے ہوں۔

کھیل زوروں پر تھا۔ سب اسی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کسی کو تن کا ہوش تھا نہ دنیا کا!
پتے پھینٹے جا رہے تھے۔ پتے بانٹے جا رہے تھے۔ چال لگ رہی تھی۔ رقم اِدھر سے اُدھر جا رہی تھی اور اُدھر سے اِدھر آرہی تھی۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا اشرفو مزاحیہ اور چبھتے ہوئے جملوں کے ساتھ بہ اندازِ اطمینان نال وصول کئے جا رہا تھا.... کھیل جاری تھا۔ کوئی ہار رہا تھا۔ کوئی جیت رہا تھا۔

اور پھر یکایک حمدو گرجا۔

"ابے او لمڈے! سالے ابھی تک نہیں بنی؟"

دوسرے کمرے سے ایک آواز آئی۔

"حمدو چچا! ابھی بنا کر لایا۔"

ذرا دھاکڑ ہو۔" اتنا کہہ کر وہ پھر کھیل میں ڈوب گیا۔ کچھ لمحوں بعد ایک دس سالہ لونڈا کوئٹہ کی خالص کچی ہری چرس سے بھری ہوئی سلفی لے آیا اور جھک کر بولا۔

"بڑی جوردار ہے۔"

"تُو بھی تو میری جان بڑا جوردار ہے۔" اشرفو نال وصول کرتے ہوئے اس کو دیکھ کر بولا اور ہلکے سے عامیانہ انداز میں دائیں آنکھ کو کچھ اس طرح دبایا کہ لونڈا شرما کر رہ گیا۔

سلفی کو دیکھ کر بہت سی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بہت سے چہروں پر خون کی لہریں رینگنے لگیں۔ حمدو نے اپنے پتے الٹے کر دیئے اور سلفی کو ہاتھ میں لے کر بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے اس کے نچلے حصّے کو چند ثانیوں تک سہلاتا رہا۔ پھر سلفی منہ میں دبا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا دیں اور اتنا زوردار کش لگایا کہ سلفی میں اچھی خاصی آگ کی لہریں اٹھنے لگیں اور خود اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلتی دکھائی دینے لگیں۔ گردن کی رگیں تن گئیں اور چہرہ شفق گوں ہو گیا ــــ بہت سارا دُھواں ہولے ہولے کسی دوشیزہ کی انگڑائی بنتا ہوا اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگا۔ اس نے سلفی برابر والے کے ہاتھ میں تھما دی اور پتے اٹھا لئے۔ ایک ہی

کش نے اس کے ذہن کی بہت سی گرہیں کھول دی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی روشنی تیز ہو گئی تھی اور اس کا ذہن بجلی کی سی سرعت سے کام کرنے لگا تھا۔

"اللہ اکبر! اللہ اکبر!"

قریب کی مسجد کے مؤذن کی خوش الحان آواز سے فضا گونج اٹھی۔ مغرب ہو چکی تھی مگر دھوپ کے ڈھلنے کے باوجود ابھی تک گرمی کی لہریں فضا کے سینے کو شعلہ بار بنائے ہوئے تھیں۔ کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا حالانکہ باہر ابھی تک سیاہی کی چادر نہیں پھیلی تھی۔ شاید اس لئے کہ کمرے میں کوئی دریچہ نہ تھا۔

اذان کی آواز سنتے ہی سب نے پتے ایک طرف رکھ دیئے اور خاموش ہو گئے "صُمٌ بُکمٌ"۔۔۔ چپ چاپ۔۔۔۔ اللہ رکھا نے قریب سے گرد سے اٹی ہوئی ٹوپی اٹھا کر احتراماً سر پر رکھ لی اور پھر اس کے دونوں ہاتھ خود بخود اٹھ گئے۔ شاید وہ جیتنے کی دعائیں کر رہا تھا۔ اللہ داد نے ہولے سے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آہستہ سے بولا۔

"مالک تیرا ہی آسرا ہے۔"

اذان ختم ہوئی تو غلام نے اپنے میلے کپڑوں پر ایک ہاتھ پھیرا اور ناخوشگواری سے اللہ داد کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"کافر کا بچہ! اذان کے وقت بھی بکتا ہے۔"

"اے باپو! اپن نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں کہا؟"

"اپن تو دعا مانگتا پڑا تھا۔ تو کیوں ناراج ہوتا ہے بائی۔"

"چل چل! اب چپ ہو جا۔ بات نائی بنا۔" شرفو نے اس کے کندھے جھنجھوڑ دیئے۔۔۔ نال وصول ہونے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس لئے اس سے نچلا نہ بیٹھا گیا۔

کھیل پھر شروع ہو گیا۔ بازی لگنے لگی۔ کسی نے مسکرا کر اپنی جیتی ہوئی رقم کو اپنے سامنے سمیٹ لیا اور کسی نے حسرت بھری نظروں سے جانے والی رقم کو دیکھا۔ کوئی جیت کے احساس سے شادماں ہو کر معمولی پتوں پر بڑی بڑی رقمیں لگانے لگا اور کوئی پے در پے شکستوں سے گھبرا کر

اچھے پتّوں کو پاکر بھی سنبھل سنبھل کر کھیلنے لگا۔

کھیل کے ساتھ ساتھ سلفی بھی گردش کر رہی تھی۔ جیسے اس کے بغیر کھیل کا مزہ ویسے ہی ہو جیسے سالن کے بغیر کھانے کا! بھینی بھینی خوشبو کی موجیں اٹھتی گئیں۔ ذہن سرشار ہوتے گئے۔ احساسات مدہوش ہوتے گئے۔

"اللہ اکبر! اللہ اکبر!"

اذان کی آواز پھر فضا میں گونجنے لگی۔ سب نے پتّے ایک طرف رکھ دیئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ انہیں اب کیا کرنا چاہیئے؟ کسی نے دونوں ہاتھ باندھ لئے۔ کسی نے تعظیماً سر کو جھکالیا۔

"کھیلو کھیلو رے۔" حمدو نے تیزی سے کہا۔

"ہوں؟" غلام نے پیشانی پر بل ڈال دیئے۔

"کوئی بات نہیں! کھیلو!" حمدو نے اسی انداز سے کہا۔ "یہ اپنے محلّے کی مسجد کی اذان نہیں ہے۔ کھیلو کھیلو! گناہ نہیں ہوگا۔ یہ دوسرے محلّے کی مسجد کی اذان ہے۔"

اور کھیل پھر شروع ہوگیا!!

آدھا گناہ آدھی عبادت

دروازے کی زوردار آواز طوفانی ماحول کے لرزتے ہوئے سینے پر ہچکولے کھاتی ہوئی بہت دور تک چلی گئی۔ حافظ جی نے چونک کر تسبیح کو ایک طرف رکھ دیا اور بے ساختہ بول پڑے۔

"یہ پہلا گاہک!"

اس وقت ان کی عجیب کیفیت تھی۔ وافر غصہ سے ان کا شکیل اور منوّر چہرہ یوں دہکنے لگا تھا جیسے موسیٰ نے خدائے ذوالجلال کے جلوہ کے اثر سے طُور کے دور افتادہ حصوں میں شعلوں کو بھڑکتے ہوئے دیکھا تھا۔ نفرت اور طیش کے مِلے جُلے جذبات سے ان کی برگد کی جڑ جیسی طویل ریش مُبارک اور جسم یوں یکسانیت اور ربط و ضابطی سے ہلنے لگے جیسے لام پر جانے والے فوجیوں کے ہاتھ اور قدم ایک ساتھ اُٹھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یوں انگارے سلگنے لگے جیسے وہ دروازے کی آواز نہ ہو بلکہ اُن کے جسمِ اقدس پر ایک زوردار اور بھرپور ہنٹر لگا ہو۔۔ انہوں نے تین مرتبہ بہ آوازِ بلند استغفار پڑھا۔ شیطان اور اس کے چیلوں پر لعنت بھیجی اور اپنی دُھندلی اور آہستہ آہستہ روشنی سے محروم ہونے والی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دریچے کے باہر آسمان کو دیکھا۔ آج ان آنکھوں کے پیالوں میں شکایت تھی، شکوے تھے اور پہلو میں لرزتے ہوئے دل کی دھڑکنیں کسی تھکے ہوئے راہی کے قدموں کی طرح آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔

"اے خدا!" حافظ جی کے سوختہ دل سے ایک آہ نکلی۔ "آخر تُو نے گنہگاروں کو کیوں پیدا کیا جو نیک، پرہیزگار اور متقی بندوں کو اپنے بُرے اعمال سے یوں صراط المستقیم سے ہٹانے

کی کوشش کرتے ہیں جس طرح شیطان نے آدم کو حوا کے ذریعہ گیہوں کھلا کر جنت سے نکال دیا تھا۔ اے میرے مولا! جس طرح تو نے نافرمان، گناہوں کے بوجھ سے لدی ہوئی قومِ لوط کو آسمان سے پتھر برسا کر نیست و نابود کر دیا تھا اسی طرح ہر بدکار اور فاسق و فاجر بندے کو تباہ و برباد کر دے تاکہ دُنیا میں کوئی گناہ جنم نہ لے سکے۔ کوئی برائی پیدا نہ ہو سکے۔"

حافظ جی نے آمین کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے اور اُٹھ کر دریچے کے پاس آگئے۔ اس وقت رات کے سینے پر طوفانی سائے لرز رہے تھے۔ ہر طرف تاریکیاں بکھری ہوئی تھیں یخ بستہ ہواؤں کے جھونکے یوں شور مچاتے ہوئے چل رہے تھے جیسے اِس آسیبی ماحول سے گھبرا کر محفوظ مقام پر جلد از جلد پہنچنا چاہتے ہوں۔ اس منظر کو دیکھ کر حافظ جی کی سُست اور تھکی ماندی دھڑکنیں بھی تیز رفتاری سے چلنے لگیں اور ذہن میں خوف کی ایک لہر کروٹ بدلنے لگی۔ اُنہوں نے اِس خوف کو زائل کرنے کے لئے یوں آیت الکرسی پڑھنا شروع کیا جیسے کوئی بیمار طاقت کے لئے ٹانک کا استعمال کرتا ہے۔

اور تب — عین اسی لمحے ان کی نظر اختری کے مکان کی طرف اٹھ گئی۔ دروازہ کھلا تھا اس طوفانی رات میں بھی، جیسے ہر راہ بھولے مسافر کو اپنی ابلیسی پناہ میں لینے کی خواہش کر رہا ہو! اس مکان کو دیکھ کر حافظ جی کا غصہ عود کر آیا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے یہ مکان نہ ہو بلکہ دوزخ کا ایک دہکتا ہوا کونا ہو۔ جیسے یہ موٹی موٹی دیواریں نہ ہوں بلکہ گناہوں کے بُت کھڑے بھولے بھالے انسانوں کو اپنی طرف بُلا رہے ہوں۔ جیسے اس گھر میں اختری نہ رہتی ہو بلکہ شیطان کی وہ حسین بیٹی ہو جس کا اولین و آخریں مقصد جیبوں کو خالی کر کے لوگوں کی عاقبت کو تاریک کرنا ہو! وہ تھی بھی اسی فطرت کی حامل!

حافظ جی ہمیشہ اُس منحوس اور نجس گھڑی پر لعنت بھیجا کرتے تھے جب اُن کی تقدیر ان کو اِس مکان میں لے آئی تھی۔ جب قسمت کی ستم ظریفی نے سب سے بڑے ولی صفت اور تہجد گزار بزرگ کو ایک فاحشہ عورت کا پڑوسی بنا دیا تھا۔ انہوں نے تو صرف اِس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر یہ مکان خریدا تھا کہ چونکہ وہ آبادی سے ذرا ہٹ کر ہے اس لئے انہیں عبادت اور زہد و تقویٰ میں آسانی ہوگی لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ قریب ہی شیطان کی بیٹی بھی اقامت پذیر ہے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا تو وہ مکان خریدنے کے خیال سے دست بردار ہو کر جنگل کی راہ ناپ لیتے

اور کسی بلند قامت درخت کے سائے میں بیٹھ کر خدا سے لَو لگاتے، لیکن انہیں اس کی کیا خبر تھی! جب انہیں اس کا پتہ چلا تو پانی سر سے اوپر ہو چکا تھا۔ چڑیاں کھیت چُگ چکی تھیں۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ گزشتہ کسی زمانے میں ان سے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور سرزد ہوئی ہو گی جس سے خفا ہو کر خدا نے ان کو ایسی سزا دی۔ انہوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ سو نفلیں پڑھ کر اس بھولی ہوئی غلطی کا کفارہ ادا کیا اور اسی جگہ بوریا بستر جمانے پر مجبور ہو گئے۔

اگر اختری کے اعمال ان کی عبادت میں مخل نہ ہوتے تو شاید حافظ جی اس کو بخش دیتے۔ مگر چونکہ دونوں کے پروگرام آپس میں ٹکرا جاتے تھے اس لئے حافظ جی کو مجبوراً اپنی پڑوسن کا دشمن بن جانا پڑا تھا ورنہ وہ خوب جانتے تھے کہ پڑوسی کے حقوق کس طرح ادا کئے جاتے ہیں۔ وہ پرانے تہجد گزار تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد رات کے دو ڈھائی بجے تک وظائف، تلاوت اور دوسری قسم کی عبادات و مناجات میں اس طرح مصروف ہو جاتے تھے کہ انہیں اپنا ہوش بھی نہ رہتا تھا کبھی کبھی تو ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزر جاتی تھی اور وہ اس وقت چونکتے تھے جب فجر کی اذاں کی سہانی آواز کانوں میں حلاوت گھولتی ہوئی نمازیوں کو انگڑائی لے کر بیدار ہونے پر مجبور کر دیتی تھی!

جب سے وہ اس مکان میں آئے تھے ان کے ایمان کا راسخ ستون لرزنے لگا تھا۔ اور انہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر وہ مزید چند روز اس مکان میں رہے تو شاید ان کی پچھلی نیکیوں پر بھی پانی پھر جائے گا اور وُہ صرف نام نہاد بزرگ بن کر دنیا داروں کی صف میں کھڑے ہو جائیں گے۔ جوں ہی وہ عشاء کی نماز کے بعد کوئی وظیفہ شروع کرتے تو کوئی نہ کوئی کار اختری کے مکان کے آگے آ کر کھڑی ہو جاتی۔ ہارن کی زوردار آواز ان کی توجہ کے تار پود کو بکھیر دیتی اور اس کے ساتھ ہی اختری کا دروازہ زور سے آواز پیدا کرتا ہوا یُوں کھلتا جیسے اپنے معزز مہمان کا گرمجوشی سے استقبال کر رہا ہو ——— اس کے بعد قہقہوں کا شور اور ہنگامے محلّے کا سکوت درہم برہم کر دیتے۔ گیتوں کی مدھر تانیں رات کی تاریکی کے لبوں میں رس بن کر ٹپکنے لگتیں ——— ممکن ہو دوسروں کے لئے یہ تفریح کا بہترین ذریعہ ہو۔ وقت گزاری کا لاجواب سامان ہو مگر حافظ جی چونکہ ان لغویات کے شروع سے ہی عادی نہ تھے اس لئے وُہ دل ہی دل میں کھولتے

رہتے۔ دل سے اختری اور اس کے جہنم کے دلالوں کو بد دعائیں دیتے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس مکان میں آنے کے بعد حافظ جی نے کسی کا بُرا چاہا تھا۔ کسی کو دل سے بد دعا دی تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے بے شمار مصیبتوں کو گلے سے لگایا تھا۔ اَن گنت تکالیف کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا تھا لیکن اس کے باوجود ان کی پیشانی پر کوئی شکن نہ اُبھری تھی۔ انہوں نے ہر تکلیف دینے والے کو راہِ راست پر آنے کی دعا دی تھی۔ لیکن یہاں آکر ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک اٹھا تھا۔ نوح جیسے عظیم المرتبت پیغمبر ضبط کا دامن چھوڑ کر اپنی اُمت کی بربادی کی دُعا مانگ چکے تھے تو پھر حافظ جی کس کھیت کی مُولی تھے۔ وہ تو انسان تھے۔ اور انسان تو صبر کا خُوگر ہی نہیں ہے۔ لیکن آفرین تھا حافظ جی پر کہ اِتنے دنوں تک صبر و ضبط کرنے کے بعد انہوں نے بد دعا کے لئے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا تھا۔

حافظ جی پھر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے جانماز پر آکر بیٹھ گئے۔ دروازے کی زوردار آواز کی بازگشت ابھی تک ان کے کانوں میں گُونج رہی تھی۔ وہ جانتے تھے اِس وقت اختری کے پاس کون آیا ہوگا؟ وہ سیٹھ احمد بھائی تھا۔ اس کے آنے کا یہی وقت تھا۔ چونکہ حافظ جی کو اِس مکان میں آئے کافی عرصہ بیت چکا تھا اِس لئے وہ اختری اور اس کے پاس آنے جانے والے ہر شخص کے نام اور عادات سے خوب واقف ہو چکے تھے۔ کچھ تو انہوں نے قیافہ شناسی سے ان کے کردار کے متعلق معلوم کیا تھا اور کچھ محلّہ والوں اور مریدوں کی مدد سے پہچانا تھا۔

تسبیح کو ہاتھ میں لینے کے بعد وہ پھر سیٹھ احمد بھائی کے سوچنے لگے۔ ان کو اس شخص سے دلی نفرت تھی۔ یوں تو اختری کے پاس آنے والا ہر شخص ان کی نفرت کا مستحق تھا مگر خصوصاً یہ آدمی حافظ جی کے نقطۂ نظر سے ناپسندیدہ ترین شخص تھا۔ اس کی موٹی اور آگے کی طرف پھیلی ہوئی توند کو دیکھ کر انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے گناہوں کی ڈھیر ساری غلاظت نے اُس کے پیٹ کو توند کی شکل میں منتقل کر دیا ہو! اس سے نفرت کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ حافظ جی کو اپنے ملازم سے پتہ چلا تھا کہ یہ شخص اپنی پھول سی نازک اور چاند سی حسین بیوی اور ایک معصوم بچی کو چھوڑ کر چوری چھپے یہاں آتا ہے اور اختری کی جھوٹی محبت پر بے دریغ ہزاروں روپیہ لٹاتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اس فعل کا ارتکاب کر کے اپنی بیوی اور بچی کی حق تلفی کر رہا تھا اور چونکہ

حافظ جی کو مذہب کے ہر مسئلہ سے شغف تھا اور اس پر اُن کی کڑی نظریں رہتی تھیں، اس لئے وہ جانتے تھے کہ اپنوں کے حقوق کو دوسروں پر نچھاور کرنا کتنا سنگین گناہ ہے۔ اس لحاظ سے سیٹھ احمد بھائی گنہگار تھا اور ہر گناہ گار سے انہیں نفرت تھی:

" لاحول ولا قوۃ ! دفعتاً حافظ جی بڑبڑائے ۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ وظیفہ پڑھتے پڑھتے نہ جانے کیا کیا اُوٹ پٹانگ باتیں سوچنے لگے تھے۔" پاک پروردگار مجھے معاف کردے!" وہ پھر عجز و انکساری سے وظیفہ میں کھو گئے ۔ تسبیح کے دانے ان کی انگلیوں میں پھسلتے رہے ۔ ان کی زبان خدا کی حمد میں مصروف ہو گئی ۔ ان کا دل خوفِ خدا اور خشیتِ الٰہی سے کانپنے لگا ۔ ان کے ذہن میں خدا کے نُور کا جال پھیل گیا ۔۔۔ اور پھر یکایک اختری کے مکان کا دروازہ اس زور سے کُھلا کہ سکوت کی چادر تار تار ہو گئی ۔ طلسمِ خاموشی کا شیرازہ بکھر گیا ۔

"دوسرا گاہک !" حافظ جی کی توجہ ہٹ گئی ۔ وہ بڑبڑائے ۔

"یقیناً یہ مختار ہوگا!" مختار ہمیشہ سیٹھ احمد بھائی کی آمد کے ایک گھنٹے بعد آیا کرتا تھا ۔ یہ ایک کسرتی جسم کا مالک تھا ۔ چہرے بشرے سے ذکاوت و ذہانت ٹپکتی تھی ۔ آنکھوں کا رنگ آسمان کی طرح بالکل نیلا تھا ۔ اس کے لباس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اچھے کپڑے پہننے کا بڑا شوق ہے ۔ وہ ہمیشہ ایک نئے اور نفیس لباس میں اختری کے دروازے کی چوکھٹ پر قدم رکھتا تھا ۔ حافظ جی کو ایک مرید کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ مختار ایک بہت بڑی کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہے اور ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جس کا ہر شخص منہ میں نوٹ لے کر پیدا ہوا تھا مگر مختار کے یہاں آنے کی ایک اور وجہ تھی ۔ جب وہ بات حافظ جی کو معلوم ہوئی تو انہیں اس سے ایک قسم کی ہمدردی ہو گئی ۔ مختار کو ایک لڑکی سے محبت تھی ۔ اس نے اپنی ہر چیز اس پر قربان کردی تھی تاکہ اس کے عوض اس کی محبت حاصل کر سکے لیکن اس لڑکی کے پہلو میں دل نہ تھا پتھر کا ایک ایسا ٹکڑا تھا جو ہر قسم کے جذبات اور احساسات سے قطعی عاری تھا ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کو مختار سے بالکل محبت نہیں ہے وہ اس کی یاد میں آہیں بھرتا رہا ۔ سائے کی طرح اس کے آگے پیچھے گھومتا رہا ۔ جس جگہ اس کو اس بے وفا کی موجودگی کا علم ہو جاتا وہ کسی نہ کسی بہانے وہاں پہنچ جاتا لیکن اس کے باوجود وہ اس کی محبت

کو نہ پاسکا۔ اس کے جذبات آہستہ آہستہ مرجھانے لگے۔ اُمید کی دیوی اس کی نظروں سے دور ہو گئی اور اس وقت تو اس کا دل ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا جب اس کو معلوم ہوا کہ اس بے وفا بیسکر نے اس کے ایک عزیز دوست کے ساتھ شادی کر لی۔ اس کے بعد مختار کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ اس نے اختری کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ جب کبھی وہ آتا اس کی آنکھوں میں غم کی شراب چھلکا کرتی تھی اور ہاتھوں میں وسکی کی دو بوتلیں! اب یہی دو چیزیں اس کے ساتھی بن چکے تھے۔

"استغفر اللہ!" اس بار حافظ جی کو غصّہ آ گیا۔ وُہ خدا کی حمد کرتے کرتے بدکاروں کے متعلق سوچنے لگے تھے۔ "اے خُدا تو نے مجھے یہاں لا کر کس مصیبت میں گرفتار کر دیا۔ دیکھ! تیرے گناہگار بندے مجھے تیری عبادت بھی نہیں کرنے دیتے۔" اُنہوں نے شیطان پر ستر (۷۰) ہزار مرتبہ لعنت بھیجی اور پھر تسبیح لے کر وظیفہ میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ....

طُوفانی رات آہستہ آہستہ مشرق کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہواؤں کے جھونکے اِس طرح شور مچا رہے تھے جیسے کسی کی موت پر سسکیاں بھر رہے ہوں۔ اور پھر .... اِس بار اِتنی زور سے اختری کا دروازہ کھُلا کہ حافظ جی اُچھل پڑے۔ غیر ارادی طور پر ان کے منہ سے نکل گیا۔

"تیسرا گاہک!"

"ہو نہ ہو یہ دینو ہو گا۔" انہوں نے سوچا۔ دینو خود کو اختری کا عاشقِ صادق سمجھتا تھا۔ وہ دن بھر ٹیکسی چلایا کرتا تھا۔ گالیاں اور مغلظات کے طُوفان بہایا کرتا تھا۔ اور رات ہوتے ہی چرس بھری سگریٹ کا میٹھا میٹھا دھواں اُڑاتا ہوا اختری کے دروازے پر پہنچ جاتا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے دوست سے کہا تھا۔

"ابے رجب! مجھے تو اختری سے محوبت ہو گئی۔ مَیں اِس پر مرتا ہُوں۔ میری آرجو ہے کہ اس کے سنگ میرا بیاہ ہو جائے۔"

"ابے مرنے کے بعد کس طرح بیاہ ہو گا۔ پاگل ہو رہا ہے۔"

حافظ جی کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ایک دن باتوں ہی باتوں میں اس نے اختری سے شادی کی درخواست کی تھی۔ اس کی بکواس پر اختری کی پیشانی پر حیرت کی سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں اور

پھر اُس کے دل میں غصّہ کا سیلاب در آیا۔ اس نے دینو کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ اس کو بھاگتے ہی بنی! اختری نے اس کو الٹی میٹم دے دیا کہ آئندہ وہ اِس کی دہلیز پر قدم رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن اس کے دو چار روز بعد دینو نے پھر آمدورفت شروع کر دی تھی۔ بھلا یہ کافر عادت بھی کہیں اس سے چھوٹ سکتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے بعد اس نے کبھی محبّت کے اظہار کی جُرأت نہ کی تھی۔ اِس کے ہم پیالہ دوست رجب کا کہنا تھا کہ اب دینو کی ظریفانہ طبیعت پر غم مسلّط ہو گیا تھا۔ وہ ٹیکسی چلاتے چلاتے خیالوں میں کھو جاتا۔ اِس طرح کئی مرتبہ وہ حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب ہر وقت بے کلی اور رنجیدگی مچلا کرتی تھی اور لبوں پر آہوں کا راج رہتا تھا۔

"یا اللہ! رحم کر!" اِس بار حافظ جی جھلّا گئے۔ وظیفہ پڑھتے پڑھتے اِن کے دماغ کی رگ پھر پھڑک گئی تھی اور وہ لغویات کے جال میں پھنس گئے تھے۔ اِس مرتبہ اُنہوں نے ارادہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی وہ یا تو اختری کے گھر میں ہنگامہ کر کے اس کو بھاگنے پر مجبور کر دیں گے یا اگر یہ ممکن نہ ہوا تو وہ خود یہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیں گے۔ اب اس جگہ مزید قیام کا مطلب زہد و اتقا کی بلند و بالا عمارت کو مکمل طور پر مسمار کرنے کے مترادف تھا۔

رات تیزی سے اپنے پَر پھیلائے صبح کی منزل کی سمت بھاگتی گئی۔ ہوائیں چیختی چلاتی رہیں۔ اختری کا دروازہ بار بار کُھلتا رہا اور بار بار توبہ استغفار کے باوجود حافظ جی اختری کے گاہکوں کی تعداد گنتے رہے۔ انہیں صرف ایک بات پر حیرت تھی۔ وہ یہ کہ آج اختری کا دروازہ بار بار کُھلا تو تھا مگر گیتوں کی صدائیں نہیں ابھری تھیں۔ شاید آج اس نے اپنے گاہکوں کو گیتوں کی بجائے باتوں سے بہلایا تھا۔ اور پھر طوفانی رات گزر گئی۔ اس سنگین رات کی صُبح بے حد رنگین تھی۔ کسی اپسرا کے خواب کی طرح! صبح کے ناشتہ سے ابھی حافظ جی فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کا ایک مرید اللہ بخش آ گیا۔

"حافظ جی آپ نے کچھ سُنا؟"

"کیا اللہ بخش؟"

"شکر ہے! اب آپ کو اختری سے نجات حاصل ہو گئی ہے!"

"ہوا کیا؟" حافظ جی نے محسوس کیا ان کا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔

"رات وہ مر گئی... اچھا ہوا۔"

"مر گئی! مگر کیسے؟"

"وہ پچھلے کچھ دنوں سے بیمار تھی۔ گذشتہ طوفانی رات نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔"

"اوہ!" حافظ جی کچھ سوچنے لگے۔

"محلے والوں کا کہنا ہے کہ رات بھر اس کا دروازہ کھلا رہا تھا اور وہ بار بار ہوا کے زور سے دیوار سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتا رہا لیکن اس میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ اُٹھ کر دروازہ بند کر سکتی۔"

"اس کے کسی گاہک نے اس کی فکر نہ کی؟"

"توبہ کیجیے حافظ جی! بھلا اس طوفانی رات میں کس کو کیا پڑی تھی کہ اس کے متعلق سوچتا" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ اختری مر چکی تھی۔ حافظ جی کو اس سے چھٹکارہ مل چکا تھا مگر نہ جانے کیوں انہیں ایسا لگا جیسے اس کی موت کی خبر سے انہیں زیادہ خوشی نہیں ہوئی ہے!!

ماتم

چھمّو بی کی آنکھوں کے آنسو ابھی خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ گھر کے سامنے ایک ٹانگہ رُکا اور ان کے دل کا غم آنسو بن کر آنکھوں کے سوتے میں جمع ہونے لگا۔ دُکھیا جی میں اس زور سے ہَول اٹھا کہ پاندان کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ خود بخود رُک گیا اور جُوں ہی انہوں نے کفن جیسے سفید برقع میں لپٹی ہوئی خلیفہ جی کی بیگم کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو ضبط کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اپنے سینے پر ایک زوردار دوہتھڑ مارتے ہوئے وہ باؤلوں کی طرح چیخیں۔

"اری چمکی، تیری آپا چلی گئیں۔ وہ ہم سے روٹھ گئیں، اری چمکی" اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے خلا میں اپنی باہیں پھیلا دیں جیسے جانے والی کو بلا رہی ہوں۔ آنے والی کا سینہ بھی شاید غم سے پھٹ رہا تھا۔ وہ بھی چیختے چلاتے، آنسو بہاتے ہوئے پاگلوں کی طرح چھمّو بی سے لپٹ گئی۔ اور پھر اس زور کا ماتمی شور اٹھا کہ دروازے کے سوراخوں سے جھانکنے والے دو تین کمسن لونڈے گھبرا کر بھاگ گئے۔ آہیں، سسکیاں، آنسو، واویلا —— فضا کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ دھرتی کا سینہ شق ہو گیا۔

"یہ کیا ہو گیا خالہ جی؟" چمکی نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "ایسا کیوں ہوا خالہ جی؟"

"ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا چمکی۔" چھمّو بی کی دھندلی آنکھوں میں بلا کی اداسی تھی۔ "بہو نے ابھی دُنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔"

"بہتر ہوتا میں مر جاتی۔"

"خدا مجھے اُٹھا لیتا ــــ میرے اللہ ــــ بڑھاپے میں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔"

"آپا کو ہوا کیا تھا؟"

"اچھی بھلی تھیں۔ موت کا تو بہانہ ہے۔" چھمو بی نے سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تین اُلٹیاں ہوئیں۔ چار دست ہوئے۔ اور ــــ اور ــــ" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا جھرّیوں بھرا چہرہ چھپا لیا اور آہستہ آہستہ سسکنے لگیں۔

"اُف خدایا۔" چمکی بھرّائے لہجے میں بولی۔ "موت کتنی ظالم ہے۔ نہ نیک کو دیکھتی ہے نہ بُرے کو! کتنے موئے، بدمعاش، چور اُچکے سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ ان کے پاس کیوں نہیں گئی۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے چمکی! جس طرح ہم بازار سے اچھا سودا خریدتے ہیں اسی طرح خدا بھی نیک بندوں کو جلد بُلا لیتا ہے۔"

"میری آپا جنّتی تھیں۔"

"کیا شک ہے؟"

"ہائے اللہ! زندگی نے انہیں صرف دُکھ ہی دیئے۔" چمکی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "جوان ہوئیں تو باپ مر گیا۔ شادی کے تین سال بعد جان جوان پہاڑ جیسا شوہر اُٹھ گیا۔"

"ہائے میرا احمد و۔" چھمو بی کو اپنے مرحوم بیٹے کی یاد آئی تو وہ چیخ پڑیں۔ سسکیوں کو جیسے مہمیز لگ گئی، آنسوؤں کے ساگر میں جیسے طغیانی آ گئی۔

اور چمکی بولے جا رہی تھی۔

"مگر اس کے باوجود وہ اللہ کی نیک بندی دکھوں کو چُپ چاپ جھیلتی رہیں۔ میں نے کبھی اُن کو زبان پر حرفِ شکایت لاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ قادرِ مطلق کے ہر حکم پر آمنّا و صدّقنا کہتی تھیں۔"

"ہاں وہ بڑی صابر بی بی تھیں۔" چھمو بی کی ایک بچی نے کہا۔

"اللہ اللہ! جوانی اور بیوگی!" چمکی نے جہاں ختم کیا تھا۔ وہاں سے پھر شروع کر دیا۔ "وہ زمانہ مجھے یاد ہے خالہ جی! جب وہ کبھی کبھی چُپ چاپ دیواروں کو تکا کرتی تھیں کبھی آپ

انہیں منحوس کہا کرتی تھیں تو...."

"اے بی! خوب کہا تم نے!" چھمو بی نے ناخوشگواری سے کہا۔" میں نے بھلا کب انہیں منحوس کہا تھا۔"

"مجھے یاد ہے آپ...."

"تمہارا حافظہ کمزور ہے۔ کسی اور نے کہا ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے خالہ جی!" چمکی نے کہا مگر اس کا چہرہ کچھ عجیب ہو گیا تھا۔" خیر میں کہہ رہی تھی کہ دنیا کے طعنے سُن کر بھی وہ بُت بنی رہتی تھیں جیسے دنیا کی ہر بات سچ ہو۔ اور پھر انہوں نے کتنے بڑے ثواب کا کام کیا۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رُکی۔ چھمو بی اس کو استفسارانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔" خالہ جی میں جکو اور چھمیا کے متعلق کہہ رہی ہوں۔"

"ہاں! انہوں نے میری شمو بٹیا کی دونوں بیٹیوں کو گود لے لیا تھا۔" اسی لمحے جب چھمو بی یہ کہہ رہی تھیں تو برابر کے کمرے سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں اُبھریں۔

"کون ہے؟" چمکی نے پوچھا۔

"جکو اور چھمیا ہیں۔"

"آتی کیوں نہیں؟"

"کمرے میں پڑی پڑی رو رہی ہیں۔ نہ کمرے سے نکلتی ہیں اور نہ کچھ کھاتی ہیں۔"

"ممانی کی موت کا بہت افسوس ہوگا۔" چمکی نے آنسو کے آخری قطرے کو پلکوں کی چلمن سے جھٹکتے ہوئے کہا۔" اور ہونا بھی چاہیئے ـــــ اللہ میرے! انہوں نے ان بچیوں کے لئے کیا کچھ نہ کیا؟ اپنی عمر وقف کر دی۔ سگی اماں سے زیادہ ان کی دیکھ بھال کی۔ مجھے یاد ہے اگر ان میں سے کسی کو ہلکی سی تکلیف بھی ہوتی تھی تو وہ بے چین ہو جاتی تھیں ـــــ اور پھر کتنے ارمانوں اور کتنی مرادوں سے ان دونوں کا بیاہ کیا۔"

اور پھر وہ دونوں کتنی دیر تک مرحومہ کی نیکیاں اور بھلائیاں یاد کر کے روتی رہیں۔ کبھی اس کے صبر و تشکر پر آنسو بہتے تھے تو کبھی اس کی اُجڑی ہوئی زندگی کی یاد پر سسکیاں اُٹھتی تھیں۔

اور کبھی اس کی بے وقت موت پر آہ و بکا، نالہ و فریاد اور قیامت خیز ماتم اٹھتا تھا۔ چمکی اچھی خاصی صحت کی مالک تھی اور عمر بھی چالیس سے زیادہ نہیں ہوگی اسی لئے رونے دھونے کا اس پر زیادہ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مگر بے چاری چھمّو بی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اُن کی ایک ایک جُھرّی پر کئی کئی غم آرام کر رہے تھے۔ ان کی دھندلی دھندلی آنکھوں پر سُوجن آگئی تھی۔ اُن کا جھولا جیسا جسم شدتِ غم سے اِدھر اُدھر جھول رہا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں بُری طرح کانپ رہی تھیں۔ جانے سے پہلے چمکی نے اُن سے کہا۔

"خالہ جی! صبر کیجئے۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں؟"

"صبر!" انہوں نے ایک آہ بھری۔ "بہو کی موت کا غم مجھے بھی مار ڈالے گا۔"

اور پھر چمکی چلی گئی اور چھمّو بی کا چہرہ عجیب و غریب جذبات کی پناہ گاہ بن گیا۔ ایسے جذبات جن کی تشریح لفظوں میں ناممکن ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل و دماغ میں سخت کش مکش ہو رہی ہے۔ جیسے وہ کچھ کرنا چاہتی ہیں مگر خواہش کے باوجود کرنے کی ہمّت اُن میں نہیں!

انہوں نے سانچی پان کا ایک بڑا سا بیڑہ جبڑے میں دبا لیا۔ اور نار تیز پتّی کا تمباکو چٹکی میں لے کر پوپلے مُنہ میں پھانک لیا اور آہستہ آہستہ اس طرح مُنہ چلانے لگیں جیسے بکری جگالی کرتی ہے۔ انہیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے تمباکو کا ہلکا سا سرور انگیز نشہ اُن کے دل میں طمانیت کے احساس کو بیدار کرتے ہوئے اُن کے غموں کو تھپک تھپک کر سُلا رہا ہو!

جب سے بہو کا جنازہ اُٹھا تھا، چھمّو بی کے بڑھاپے میں روگ لگ گیا تھا۔ اُن کے چین و سکون کو زنگ لگ گیا تھا۔ پہلے ہی سے وہ کمزور تھیں اور صحت اس قابل نہ تھی کہ آنسوؤں کے بوجھ کی متحمل ہوسکتی اور سسکیوں کی ٹیسوں کو برداشت کر سکتی۔ اور پھر تعزیت کرنے والوں کا ہجوم! اُن کے تصوّر میں بھی یہ بات نہ تھی کہ بہو کی موت کا اتنے زیادہ لوگوں کو غم ہوگا۔ گزشتہ دو دنوں میں انہوں نے ایسی ایسی عورتوں کے چہرے دیکھے تھے کہ اس سے پہلے ان کے سایوں سے بھی نا آشنا تھیں۔ کوئی مرحومہ کے دُور کے رشتہ کی بہن نکلی تو کوئی خالہ کی بیٹی کی نند ثابت ہوئی۔ کوئی اس کی احسان مند تھی تو کسی کے باپ کی موت

میں وہ شریک ہوئی تھی۔ نہ جانے کیسے انہیں اس کی موت کا علم ہوگیا تھا۔ نہ اخبار میں خبر آئی تھی نہ گھر گھر کہلوایا گیا تھا۔ جنازے میں کُل آٹھ آدمی تھے مگر دفنانے کے بعد پُرسے کے لئے اتنی عورتیں آگئیں کہ ہر آدمی کو دس سے ضرب دینے کے بعد جتنی تعداد ہوتی ہے اس سے شاید کچھ زیادہ ہی! ہر ایک کو مرحومہ کی بے وقت موت کا غم تھا اور جو بھی آتی وہ چھمّو بی کے زنگ خوردہ صندوق جیسے سینے سے لپٹ کر اس زور سے پھوٹ پھوٹ کر روتی کہ چھمّو بی کا دل شدّتِ غم سے بھر آتا اور وہ پُرسہ دینے والی عورت سے زیادہ تیزی سے رونے کی کوشش کرتیں۔ جیسے دونوں میں آنسو بہانے کا مقابلہ ہو رہا ہو! اور پھر جب رونے دھونے کے بعد آنسو خشک کئے جاتے، سسکیوں پر قابو پایا جاتا، خدا کی مرضی کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا، تسلّی تشفی کی بات ہوتی، زخم پر مرہم رکھنے کی تیاری ہوتی اور جب پُرسہ دینے والی عورت چلی جاتی تو چھمّو بی کی حالت غیر ہو جاتی۔ بوڑھا دل ہانپنے لگتا۔ سُوکھی لکڑی پر چمڑے چڑھے جیسے ہاتھ کانپنے لگتے اور ان کا ہاتھ خود بخود پاندان کی طرف بڑھنے لگتا اور پان تمباکو کھا کر ایک لمحہ کے لئے اطمینان ملتا مگر دوسرے ہی لمحے —— جوں ہی گھر کے سامنے کسی سواری کے رُکنے کی آواز آتی تو وہ پریشان ہو جاتیں اور وہ رونے کا نیا سلسلہ شروع کرنے کے لئے تیار و مستعد ہو جاتیں۔

چمکی کو گئے دس منٹ ہوئے تھے کہ برابر کا کمرہ کھلا اور جگّو اور چھمپا باہر نکلیں۔ دونوں کے لب مسکرا رہے تھے اور وہ ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔ چھمپا کے ہاتھ میں ایک سُرخ سیب تھا۔

"لو نانی اماں! تم کھاؤ!"

"نہ بٹیا، تم کھاؤ! میرے دانت کہاں!" چھمّو بی کا لہجہ کچھ ناخوشگوار تھا۔ انہوں نے ایک لمحے کے لئے دونوں کو گھور کر دیکھا اور پھر دائیں جانب دیوار پر رینگتی ہوئی ایک چھپکلی کو دیکھنے لگیں۔ اُن کا مُنہ ابھی تک جگالی کر رہا تھا اور پان کی پیک کے چند چھینٹوں کی سُرخی ٹھوڑی کے اوپری حصّے پر صاف نظر آ رہی تھی۔

"نانی اماں! آج شام چلی جاؤں گی۔" جگّو بولی۔

"اور میں بھی" چھمیا نے کہا۔

"دو روز اور ٹھہر جاؤ" چھمو بی نے اسی انداز سے کہا "دیکھتی نہیں ہو پرسہ دینے والے ابھی تک آرہے ہیں"

"وہ ناراض ہو جائیں گے نانی اماں"

"اور میرا چھلو رو رہا ہوگا"

اس بار انھوں نے کوئی جواب نہ دیا مگران کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ اُن کا موڈ اچھا نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"نانی اماں!" چھمیا بولی "ممانی جان نے کچھ چھوڑا نہیں؟"

"کیا مطلب؟" وہ گھورنے لگیں۔

"کوئی انگوٹھی وغیرہ! سنا ہے اُن کے پاس زمرد اور یاقوت کی انگوٹھیاں تھیں۔ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ پچھلے دنوں میری انگوٹھی کھوگئی"

"مجھے نہیں معلوم! میں اُن کے سامان کی محافظ نہیں تھی" وہ انجان بننے لگیں اور وہ دونوں برابر کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ اور چھمو بی مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑانے لگیں۔ اسی لمحے ان کی کمر میں درد کی ایک لہر اٹھی اور وہ ہولے ہولے کراہنے لگیں۔ گذشتہ دو دنوں سے وہ چند گھنٹوں سے زیادہ چارپائی پر نہیں لیٹی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے اُن کی بوڑھی ہڈیاں دُکھنے لگی تھیں۔ بہو تو ایک لمحہ کی تکلیف برداشت کر کے اطمینان سے خاک تلے سوگئی تھیں اور جاتے جاتے اُن کے کلیجے میں آگ کی تپش بھر گئی تھیں۔ چین بھی لُٹ گیا تھا، قرار بھی کھوگیا تھا۔ بھلا چھمو بی کی یہ رونے کی عمر تھی؟ رنج اٹھانے کی تھی؟ انہیں تو اس عمر میں آرام کی ضرورت تھی مگر آرام تو جیسے اُن کے لئے حرام ہوگیا تھا۔ نہ جانے قدرت اُن سے کس دن کے گناہ کا بدلہ لے رہی تھی۔

یہ تعزیت کرنے والے بھی کتنے کٹھور تھے۔ نہ اُن کی عمر دیکھتے تھے نہ اُن کی صحت! بس اُن کو تو جیسے رونے سے کام تھا۔ اُن کے دل کی بھڑاس نکل رہی تھی اور چھمو بی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ گزشتہ دو دنوں میں وہ ادھ موئی ہوگئی تھیں۔ نہ زندوں میں نہ مُردوں میں۔ نہ کھانے کا ہوش نہ سونے کا خیال۔ بھوک تو جیسے بہو کے ساتھ ہی مرگئی تھی۔ اب اُن کی ایک ہی

دُعا تھی۔ وہ یہ کہ اب کوئی پُرسے کے لیے نہ آئے انہیں یقین تھا کہ اگر آٹھ دس عورتیں یکے بعد دیگرے تعزیت کے لئے آگئیں تو یقیناً لوگوں کو اُن کے کفن خریدنے کا انتظام کرنا پڑے گا۔ زندگی میں شاید وُہ اتنا نہ روئی تھیں جتنا وہ دو دنوں میں روئیں۔ ہر ہچکی کے ساتھ انہیں خیال آتا تھا کہ اب جان نکلی، اب جان نکلی!

دو گھنٹے گزر گئے۔ کوئی نہیں آیا۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ شاید خدا کی مرضی ہو کہ وہ چند روز اور جئیں۔ اس دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے برابر کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ دونوں لڑکیاں بستر پر ساتھ ساتھ لیٹی ہنسی مذاق کر رہی تھیں اور نہ جانے کیا کُھسر پُھسر کر رہی تھیں۔ انہوں نے بُرا سا منہ بنا لیا اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی جگہ آکر بیٹھ گئیں۔ اور پھر جوں ہی دُھوپ سامنے کی دیوار پر پھیلی یکایک دروازے پر موٹر رکشا کے رُکنے کی آواز آئی اور جیسے کسی نے ان کی روح قبض کر لی ہو۔ ہاتھوں کے طوطے اڑنے لگے، دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ وہ اٹھیں، سنبھلیں، گرتے پڑتے، ڈگمگاتے ہوئے برابر کے کمرے میں گھس گئیں۔ چھمیا سنگھار میز کے سامنے کھڑی ناز و ادا سے اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور جگو مسہری پر اوندھی لیٹی، کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ چھمو بی کو اِس طرح کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر دونوں کچھ بوکھلا گئیں۔

"کیا ہوا نانی اماں؟"

"پھر کوئی آیا ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولیں۔

"پھر ---؟"

"ارے مَیں کہتی ہوں کیا تمہارے دیدوں کا پانی مر گیا؟" وہ چیخنے لگیں۔ "تمہاری غیرت سو گئی۔ ڈھٹائی اور بے حیائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم دونوں آرام سے ہو اور میں --- جو بھی پُرسے کے لئے آتا ہے میں اُس کے ساتھ روتی ہوں۔ میں بُڑھیا کب تک روتی رہوں گی۔ رونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" وہ ایک لمحہ کے لئے سانس لینے رکیں، پھر بولیں۔ "اب اگر تم دونوں نے میرا ساتھ نہیں دیا تو میں بھی نہیں روؤں گی۔ کیا تم دونوں مجھ بُڑھیا کو رُلا رُلا کر مار ڈالو گی؟"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

دل ڈوبنے کا منظر

"ہر منظر کا اپنا حُسن ہوتا ہے۔ ہر نظارہ انسانی ذات کی تکمیل کی طرف ایک قدم ہے مگر ......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اُس کی آنکھوں کی تیز یاقوتی چمک میں جیسے کسی عہدِ عتیق کے مصلوب پیغمبر کا علامتی پیغام تھا کہ جس کا مفہوم میں سمجھ نہ سکا۔ میں چپ چاپ گمبھیر بیمابی شش و پنج کا شکار اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے شاید میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے میرے چہرے پر لکھے ہوئے اس سوال کو پڑھ لیا تھا جو میں پوچھنے کی خواہش کے باوجود پوچھ نہ سکا تھا۔ اچانک ایک پُراسراری مسکراہٹ سانپ کی طرح سرسراتی ہوئی اس کے ہونٹوں کی پگڈنڈی پر سے گزر گئی۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟" اُس نے شانِ استغناء کے ساتھ گردن کو ہلکے سے جھٹک دیا۔ "ہاں تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں ایک ایسے ہی منظر کی تلاش میں ہوں جس کو میں نے بارہا محسوس تو کیا ہے مگر بکراں خواہش کے باوجود دیکھ نہیں سکا ہوں۔"

"کون سا منظر؟" میرے اشتیاق کو مہمیز لگ گئی۔

"دل ڈوبنے کا منظر!!"

میں نے بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ اُسے دیکھا۔ میرے ردِّ عمل نے جیسے اُسے خاصا مایوس کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے یاقوتی شعلے اچانک راکھ بن کر بکھرنے لگے!

"تم بھی دوسروں سے مختلف نہیں" اس نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔ "ہر آدمی دوسرے کی طرح ہے۔ کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کوئی یہ جاننا بھی نہیں چاہتا۔ تم سب کا یہ خیال

ہے کہ میرا دماغ چل گیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ میں صداقت کا متلاشی ہوں۔ مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں خود کو دریافت کروں۔"

میں نے پُرخیال انداز میں اپنا سر ہلایا اور پھر چپ چاپ اُسے دیکھنے لگا۔

"زندگی کے اَن دیکھے گوشوں پر سے میری تجسّس نے پردہ اُٹھایا۔" وہ پھر گویا ہوا۔ "ہر نادیدہ گوشے پر سے جب پردہ اٹھا تو ایک نظارہ میرے سامنے آیا جس نے طمانیت کے گریز پا لمحوں سے مجھے روشناس کرایا۔ مگر میری شناخت اُس وقت مکمّل ہوگی جب میں اپنی زندگی سے متعلق ہر نظارہ کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لوں گا اور اس وقت ابد کے اسرار و رموز میری مُٹھی میں ہوں گے۔"

میں نے جواب میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا، اور پھر کچھ دیر بعد جب وہ چلا گیا تو میں صرف گہری سانس لے کر رہ گیا — ایک دُنیا نے اُسے ناقابلِ علاج کیس قرار دے دیا تھا۔ اب پتہ نہیں یہ اُس کی بے پایاں ذہانت تھی یا افتادِ طبع کا نتیجہ کہ اُس کی باتیں تجریدی کہانیوں کی طرح سننے والوں کو اُلجھا کر رکھ دیتی تھیں — تھوڑا سا اسکرو تو شاید بچپن ہی سے ڈھیلا تھا مگر کالج پہنچنے کے بعد تو جیسے وہ بالکل ہی بے لگام ہو کر رہ گیا۔ اس کی باتوں کی بالائی اور زیریں پرتوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا۔ اُس کی بہت کم باتیں سماعت سے ٹکرا کر واضح مفہوم کا سبز سگنل دیتی تھیں ورنہ ہوتا یوں کہ سننے والا اس کی باتوں کا سر پیر کچھ سمجھ نہ پاتا اور انہیں مجذوب کی بڑ سمجھ کر سُنی اَن سُنی کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا۔ کچھ لوگ اس کی باتوں کو لطف اندوز ہونے کی حد تک دلچسپی سے سنتے اور پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتے۔ مگر اس کی تجریدی گفتگو کے بے ربط فلسفہ نے اُس بوڑھے والدین کو غضب ناک حد تک اس سے متنفر کر دیا تھا۔ وہ اُس کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ گھر میں اُس کی حیثیت ایک اجنبی سے زیادہ نہ تھی۔ حد تو یہ کہ اُس کے چھوٹے بھائی بہن بھی اُسے اس انداز سے دیکھتے جیسے اُن کے سامنے دنیا کا آٹھواں عجوبہ آ گیا ہو!

"کیا تمہیں اس کی پرواہ نہیں کہ تمہارے خیالات نے ہر شخص کو تم سے دور کر دیا ہے۔"

ایک بار میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میری بات سن کر کچھ اس فراخدلی سے ہنسا

کہ میں متوحش ہو کر رہ گیا۔

"مجھ سے دور جا کر ہی لوگ ایک دن میرے پاس آئیں گے۔" اس کے ادق فلسفہ نے میری قوتِ سمجھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "میرا اسلوبِ فکر میری نمائندگی کرتا ہے۔ لوگ کیوں چاہتے ہیں کہ میں دوسروں کی نقل بن کر زندہ رہوں؟ اگر میرے خیالات نزاعی ہیں تو لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر بڑے خیال کی یہی ایک خوبی ہوتی ہے۔"

"مگر تمہارے خیالات عصری روح سے ہم آہنگ نہیں۔" میں نے اُسے ٹوکا۔

"کیا یہ زندہ رہنے کی کوئی شرط ہے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ میرے خیالات میری اپنی روح سے ہم آہنگ ہیں؟"

"مگر معاشرتی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ اکثریت کا ساتھ دیا جائے۔" میں نے اُسے حقیقت کی طرف لانے کی کوشش کی۔

"مجھے معاشرتی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اپنی زندگی اپنے انداز سے گزارنا چاہتا ہوں۔" یہ اُس کا ناقابلِ تسخیر جواب تھا اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اُسے قسمت کے حوالے کر دیا جائے!

ان دنوں اُس کے فلسفیانہ خیالات اور اچھوتے نظریات کا چرچا دُور دُور تک تھا جہاں کہیں وہ بیٹھ جاتا نئے مباحث، مناظرے اور مجادلے کی بھرپور کیفیات کے ساتھ لوگوں کی تفریحِ طبع کا سامان بن جاتے۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ بحث و تمحیص سے پیدا شدہ تلخی کے سبب ایک بڑے میاں نے جذباتیت سے مغلوب ہو کر ایسا پتھر مارا کہ اُس کا سر پھٹ گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ بڑے میاں اپنی نسل کے باب میں نئی نسل کی برفانی بے حسی کی شکایت کر رہے تھے کہ وہ ایک غیر متعلق بات کے ساتھ دخل در معقولات کا مرتکب ہوا!

"بڑی عمر کے لوگ بے وفائی کی خواہش کے باوجود بے وفائی کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔" بڑھاپے کے متعلق یہ اس کا اچھوتا نظریہ تھا۔ "نوجوان چاہے ابتذال کا شکار ہو یا جذب و سلوک کی منزلوں کا مسافر — ایک مخصوص اور تعین شدہ مستقبل اُس کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے مگر بڑھاپے کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کا کوئی مستقبل نہیں۔"

بڑے میاں ویسے ہی نئی نسل کی حرکتوں سے نالاں تھے۔ اُس کی جب یہ بات سُنی تو اُن کے صبر و ضبط نے آخری ہچکی کے ساتھ دم توڑ دیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک نوکیلے پتھر سے اس کا سر پھوڑ دیا۔ آس پاس کھڑے لوگوں کا کہنا تھا کہ ردِ عمل کے طور پر اُس نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ بس کچھ دیر تک ہنستا رہا اور پھر آستین سے خون پونچھتا ہوا بڑے میاں کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا!

پھر ایسا ہوا کہ وہ کالج سے غائب رہنے لگا۔ شروع شروع میں تو اُس کی غیر حاضری کو شد و مد سے محسوس کیا جانے لگا۔ اُس کی باغ و بہار شخصیت کے بوقلموں پہلوؤں کو اتنی جلدی بھول جانا اتنی آسان بات بھی نہ تھی۔ مگر زندگی تو ایک وسیع اور بیکراں سمندر ہے۔ ایک لہر کے کھو جانے سے سمندر کے معمولات میں فرق تو نہیں آتا۔ نئے ہنگاموں اور نئی رونقوں کے پس منظر میں کب تک پرانے لوگوں سے وابستہ یادوں کی پرچھائیاں اپنی انمٹ نقوش چھوڑ سکتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید اس نے تعلیم کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا ہو۔ فراست بن منزل کی راہی ہو تو صاحبِ فراست راستوں کے پیچ و خم میں بھٹک بھی سکتا ہے ـــــ ایک دن سرِ راہے اُس کے والد سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اس کی بابت دریافت کیا تو ان کا چہرہ دُکھ اور ذہنی اذیت سے پیدا شدہ جذبات کی آماجگاہ بن گیا!

"میاں! اب وہ بھلا کیسے کالج آسکتا ہے۔ وہ تو اپنے حواس میں نہیں!"

"قبلہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "اب اُس کے فلسفہ نے دیوانگی کی بھیانک شکل اختیار کر لی ہے۔ پتہ نہیں دن رات کیا کیا بکواس کرتا رہتا ہے۔ چند روز قبل مجھ سے کہنے لگا۔ ابا جان میں نے وجدان اور بصیرت کی ساری قوت صرف کر دی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہنوز میری ذات نامکمل ہے۔ آپ کو پتہ ہے ابا جان اس کی کیا وجہ ہے؟ میں دل ڈوبنے کے منظر کو مجسّم نہیں کر سکا ہوں۔"

"آپ حوصلہ سے کام لیں چچا جان۔" میں نے ڈھارس دینے کی کوشش کی ـــــ "وہ

ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بیٹا! میری عمر ایسی نہیں کہ طفل تسلیوں سے بہل سکے۔ اب دعا کرو کہ اس کی اور ہماری دونوں کی مشکل آسان ہو جائے۔ روز روز کے رونے سے چند روز کا رونا زیادہ بہتر ہے۔"

اُس شام میں اُس کے گھر گیا۔ اس کی حالت ناقابلِ شناخت حد تک بدل گئی تھی۔ داڑھی اُس نے چھوڑ رکھی تھی۔ سر کے بال تارِ عنکبوت کا منظر پیش کر رہے تھے۔ میلے کپڑوں سے عجیب قسم کی ناقابلِ برداشت بدبو آ رہی تھی ــــــ پہلے تو مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ پھر چند لمحوں تک بے ساختگی کے انداز میں ہنستا رہا۔ پھر بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ مگر اس حالت میں بھی اس کا انداز ایسا نہ تھا کہ کوئی اُسے ہوش و حواس سے ماوراء سمجھتا۔ میں بڑی دیر تک اس کی باتیں ضبط و تحمل سے سنتا رہا۔

"دنیا والوں سے سمجھوتہ کے لئے روح کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دنیا میں کوئی سچا نظریہ کوئی صادق جذبہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اگر آج کرائسٹ بھی دنیا میں دوبارہ آ کر اپنے نظریات کا پرچار کرتے تو وہ بھی ففتھ کالمسٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کر لئے جاتے! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہمیں اپنے حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے جبکہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ کر نہیں پاتے!"

"ہم کیا کرنے کے خواہشمند ہیں؟" میری بات سن کر وہ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"اس کا جواب ہر شخص یہی دینا چاہے گا کہ ہم جس قسم کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں اس کے لئے ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ مگر لوگ منافقت کی حد تک جھوٹے اور ڈرپوک ہیں۔ سب میں اخلاقی جرأت کا فقدان ہے۔ کوئی یہ بات ہرگز نہیں کہے گا اور چپ چاپ وہی زندگی گزارے گا جو وہ گزارنا نہیں چاہتا ـــــ"

"اپنے متعلق بھی کیا تم یہی کہو گے؟"

"نہیں۔ میں منافق نہیں" وہ تیقّن کے ساتھ بولا: "میں اپنی پسند کی زندگی گزار رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مجھے مصلوب کیا جا رہا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرا اعصابی نظام بُری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میں خدا حافظ کہے بغیر اس کا کمرہ چھوڑ دوں!!

پھر نہ معلوم وقت کی طویل زقند نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ میں گن گن کر قدم اٹھاتے ہوئے فارغ التحصیلی کی دشوار گزار منزل کی طرف بڑھتا گیا۔ مگر اُس نے کالج سے ہمیشہ کے لئے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کے لایعنی فلسفہ کی موشگافیوں نے مجھے لاجواب کر دیا۔

"شیکسپیئر ڈگری یافتہ نہیں تھا لیکن ذہانت کی میزان کے ایک پلڑے میں اگر ہم اُسے بٹھا دیں اور دوسرے میں ایک درجن قابل ترین ڈاکٹرز آف فلاسفی کو ـــــ تو تم خوب جانتے ہو کہ کون سا پلڑا زیادہ وزنی ہوگا!!" اُس کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں دل برداشتگی کی تلخیوں کو ہمرکاب لئے گھر لوٹ آیا۔ ایک ڈوبتے شخص نے اس یقین کی بنیاد پہ میری مدد کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا کہ ڈوب جانے پر ہی اُسے ابدی نجات کی زرنگار دہلیز پر قدم رکھنے کا موقعہ حاصل ہوگا۔ میرے نزدیک یہ انسانی المیہ کی ایک ایسی کہانی تھی جس کا کوئی عنوان نہ تھا!!

مجھے وقتاً فوقتاً اس کی بابت معلومات ملتی رہیں۔ میں نے سنا کہ ایک بار اُس کے والد صاحب نے اُسے پاگل خانہ پہنچانے کے سارے انتظامات مکمل کر لئے تھے مگر قریبی رشتہ داروں اور محلّے والوں کے سمجھانے پر بادلِ نخواستہ اپنے ارادے سے باز آ گئے۔ اُس کے گھر کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اس کے فلسفہ کی غیر منطقی کوکھ سے جو آگ بھڑکی تھی اُس کے شعلوں نے اُس کے سارے گھر والوں کے چین وسکون کو خشک لکڑیوں کی طرح جلا کر بھسم کر دیا تھا۔

پھر ایک دن جب میں گھر لوٹا تو مجھے اُس کا پیغام ملا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میرے

گھر والے ضرورت سے کچھ زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ میرا اُس سے ملنا عاقبت نااندیشی کا برملا ثبوت ہو سکتا ہے۔ مجھے دبے الفاظ میں سمجھانے کی بھی کوشش کی گئی مگر دوسرے دن میں اُس سے ملنے اُس کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے وجود کا محض سایہ بن کر رہ گیا ہے۔ یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا جسم آہستہ آہستہ اس کے عقل کی غذا بنتا جا رہا ہو —— ہم بہت دیر تک گزرے ہوئے وقت سے وابستہ یادوں کو خوشگوار انداز میں دہراتے رہے۔ اس کی گفتگو، اس کا پیرایہ اظہار اور اس کا طرزِ عمل اس وقت نارمل آدمی کی ذہنی و جذباتی کیفیات کا آئینہ دار تھے۔ اُس کے اعصاب مکمل طور پر اُس کے قابو میں نظر آ رہے تھے۔ میں یہ سوچ کر خوشی محسوس کرنے لگا کہ اُس کی پرانی ذہنی تندرستی بحال ہو گئی ہے۔ لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ بات چیت کے دوران اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ حلقوں کے اندر اُس کی آنکھوں نے تیزی سے گردش کرنا شروع کر دیا۔ اس کی زبان میں یوں لکنت آ گئی کہ اس کی آواز کسی اجنبی کے لب و لہجہ میں ڈھل کر جیسے کسی اندھے کنوئیں کے پاتال سے آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی۔ مجھے احساس ہوا کہ خود پر قابو پانے کی بے انتہا کوشش نے ردِ عمل کے طور پر اُس کے جسم کو بیدِ مجنوں کی طرح لرزنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میرے ذہن کے کسی کونے میں خوف کی پرچھائیوں نے سر اُٹھایا۔ مگر میں چند لحظوں میں اپنے حواس کے بکھرے ہوئے تار و پود کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا —— کچھ دیر بعد جب اس کی حالت میں کچھ افاقہ ہوا تو وہ ایک اجنبی کی طرح چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"تم نے سمندر کے سینے پر مچلتے ہوئے طوفانوں کو دیکھا ہے؟ کبھی تمہیں احساس ہوا کہ یہ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ اُفق پر سورج طلوع ہونے سے ہمیں زندگی میں ایک نئے دن کا پیغام ملتا ہے پھر غروبِ آفتاب دن کے زوال کا ایک جیتا جاگتا اعلان ہے۔ بہار میں سبز پتّوں کی اوٹ سے جھانکنے والی پھولوں کی تر و تازہ مسکراہٹیں، خزاں میں رنگ بدلتے ہوئے خشک پتّوں کو بے وطنی پر مجبور کرنے والی بیدرد ہوائیں —— بدلتے ہوئے موسموں کے بدلتے ہوئے مناظر —— یہ سب کیا ہیں؟ ہماری زندگیوں کے مختلف دیکھے اور اَن دیکھے پہلوؤں کی عکاسی ہی تو

کرتے ہیں! ہر منظر کے پس منظر میں ہماری زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو اُجاگر ہے۔ قدرت اشاروں میں ہم سے باتیں کرتی ہے مگر ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو ان اشاروں کو سمجھ کر انہیں عملی زندگی کی جزئیات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟"

وہ باتیں کرتے کرتے توقف پر مجبور ہو گیا۔ اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں عرقِ انفعال کے قطروں کی طرح رقصاں ہو گئی تھیں اور چہرہ تھکے ہوئے اعصابی مریض کا آئینہ بنا ہوا تھا —— میں نے چاہا کہ اس کا دھیان اس مخصوص موضوع سے ہٹا کر ایسی باتوں کی طرف لگا دوں جو اعصاب پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ مگر اس وقت اس کا انداز بالکل ہٹ کی منہ بولتی تصویر نظر آ رہا تھا —— اس نے میری باتوں کو سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اپنی اعصاب شکن گفتگو کے سلسلے کو مزید آگے بڑھایا۔

"ہم سب ابد کے تنہا مسافر ہیں۔ موت کس نئی زندگی کا نام ہے، اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا اور نہ جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر میری اپنی زندگی صداقت کا دوسرا نام ہے۔ میں نے دیکھے اور اَن دیکھے نظاروں کے پس منظر میں اپنی زندگی کے شناسا اور اجنبی پہلوؤں کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر نیا منظر میری ذات کی تکمیل کی طرف ایک قدم رہا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا کہ آج سے چند سال قبل میں نے تم نے کہا تھا کہ میری ذات کی تکمیل ایک ایسے منظر کی رہینِ منت ہے جو میرے محسوسات کا ہمزاد تو ہے مگر میں جسے مجسّم کرنے سے قاصر رہا ہوں۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "تم دل ڈوبنے کے منظر کی بات کر رہے ہو نا؟"

"تمہارا اندازہ سو فیصد ٹھیک ہے۔" اس کا چہرہ خوشی کی تمازت سے سرخ ہو گیا۔ "میں اسی منظر کی بات کر رہا ہوں۔ میرے دوست! شاید تم میری بات پر یقین نہ کرو مگر یہ حقیقت ہے کہ میری ذات کی تکمیل ہو چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا ...." میں غیر ارادی طور پر بے اختیار چونک پڑا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس دیا۔ خوشی شرارتی بچوں کی طرح اس کے چہرے پر اُچھل کود رہی تھی۔

"آج پس منظر کا ہر منظر میرے پیشِ نظر ہے۔" متانت کی متوازی شکنیں پھر اُس کے ماتھے پر

نمودار ہوگئیں۔ جس آخری منظر کی تلاش مجھے تگ ودو کے صحراؤں میں بھٹکا رہی تھی اس کو میری نظروں نے مقید کر لیا ہے۔ آج میں کائنات کے اسرار و رموز کا امین ہوں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا ذات کی تکمیل کے بعد بھی زندہ رہنے کا کوئی جواز ہے؟"

اُس کے ہر پچھلے سوال کی طرح اس سوال کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں حیران و پریشان اُس کے چہرے پر بے قابو خوشی کو بے لگام ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آج جیسے اُس کی ذات ابد کی پھیلتی ہوئی سرحدوں سے گلے ملنے کے لئے بیکراں ہوتی جا رہی تھی۔ میرے سامنے ایک ایسا جیتا جاگتا عجیب و غریب منظر آنکھیں مل رہا تھا جس نے ایک اعصابی مریض کے اعصاب شکن خواب کی طرح شعور اور لاشعور کی ساری صلاحیتوں کو چند ثانیوں کے لئے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا تھا! وہاں پر مزید بیٹھنا اب میرے لئے ناممکن تھا!!

یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیمی ڈگریوں کا بوجھ سر پر اٹھائے میں عملی زندگی کے دشوار گزار راستوں پر بھٹکتے ہوئے اپنے آپ سے کچھ ایسے سوالات پوچھ رہا تھا جن کے جواب شاید کسی کے پاس نہ تھے۔ ملازمت کی تلاش سرابوں کا تعاقب ثابت ہو رہی تھی۔ زندگی فلسفۂ وجودیت کا نمونہ نظر آ رہی تھی۔ میں اُس سے دوبارہ ملنے کی منہ زور خواہش کے باوجود مل نہ سکا۔ کارِ جہاں دراز کی گوناگوں مگر ناخوشگوار مصروفیات نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ روز یہی سوچتا کہ کل اس سے ضرور ملوں گا مگر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کل کبھی نہیں آتا۔ بس یہی کچھ ہوا اور یوں میری اُس سے وہ آخری ملاقات ثابت ہوئی ـــــ پھر ایک دن جب مجھے اُس کی موت کی خبر ملی تو یہ خبر بھی دو دن پرانی ہو چکی تھی ـــــ اور تب جیسے میں زندگی کی اہم ترین مصروفیات کو بھی بھول چکا تھا۔ میں نے اُس کے گھر پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ حالات وہاں غیر معمولی نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید کسی نے اُس کی موت پر رونے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی یا ممکن ہے رو دھو کر سب کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ ویسے میں نے اس کے والد کے جھریوں سے لدے ہوئے چہرے پر گہری اُداسی کی ایک ایسی کالی گھٹا کو دیکھا جس کو کھل کر برسنے میں شاید تھوڑا بہت تامل تھا! میں رسمی تعزیت کے بعد کچھ دیر اُن کے ساتھ بیٹھا رہا پھر جب چلنے کے لئے اجازت طلب کی تو وہ بولے۔

"میاں! اب تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے اُس کی بہت ساری باتیں غلط نہیں تھیں۔" اُن کے لہجے میں ہچکچاہٹ سی تھی۔ "میں تمہارے چہرے پر حیرت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ رہا ہوں مگر تمہیں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ دمِ واپسیں میں نے اُس کی آنکھوں میں جو کچھ دیکھا اُس کے بعد یہی کچھ کہنے پر مجبور ہوں۔"

"آپ نے کیا دیکھا چچا جان؟" میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرے استفسار پر ایک لمحے کے لئے اُن کے چہرے پر تذبذب کے رنگوں کا فوارہ اُبل پڑا۔ وہ پھر بولے۔

"حالت تو اُس کی نہ معلوم کب سے خراب تھی مگر اُس دن اچانک بگڑ گئی۔ وہ نہ معلوم کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ کبھی کبھی اُس کی آواز تیز ہو جاتی۔ اس کی باتوں کا سر پیر کچھ سمجھ میں نہیں آیا ــــ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے دم توڑ دیا۔ بس ایک دو باتیں مجھے ہنوز یاد ہیں اور وہ بھی شاید اس لئے کہ اُس نے متعدد بار انہیں دہرایا تھا!"

"کون سی باتیں چچا جان؟" میرا دل اچانک سینے کے پنجرے میں زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

"وہ میری طرف دیکھتا اور بار بار یہی کہتا ابا جان! ذات کی تکمیل کے بعد زندہ رہنے کا کیا جواز ہے؟ مرتے وقت تو آدمی کی آواز کمزور پڑ جاتی ہے مگر میاں! اُس کی آواز میں اتنی توانائی نہ معلوم کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ پھر کہنے لگا ابا جان! اس وقت میرے سامنے جو منظر ہے آپ اس کو میری آنکھوں میں مجسم دیکھ سکتے ہیں۔ یہ منظر میری تمام زندگی کی تگ و دو کا حاصل ہے۔ پھر اُس کے چہرے پر ایک پُراسرار سی غیر ماورائی مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ بیٹا! یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ جس شخص نے طوفانی سمندروں سے زیادہ ہنگامہ خیز اور کرب سے بھرپور زندگی گزاری تھی وہ اس طمانیت اور سکون سے موت کی آغوش میں چلا گیا جیسے کوئی بچہ ماں کی محبت آمیز لوریوں کو سنتا ہوا چپ چاپ سو گیا ہو ــــ موت کے بعد بھی اُس کی آنکھیں وا تھیں۔ میں نے آگے جھک کر جب اُس کی آنکھوں کو بند کرنا چاہا تو بے اختیار چونک کر رہ گیا۔ میں نے اُس کی مُردہ آنکھوں میں ایک ایسے زندہ منظر کو دیکھا جو کیمرے کے فوٹو کی طرح تمام تر جزئیات لئے ہوئے تھا۔"

وہ اچانک چپ ہو گئے۔ اس موڑ پر میں چونک کر ان کی طرف کچھ زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر بہت ساری نازک چیزوں نے ٹوٹ پھوٹ کر مجھے لہولہان کر دیا ہو!

"یہ منظر وہی منظر تھا جس کے متعلق جب کبھی اُس نے بات کی تھی تو میں اُسے مجذوب کی بڑ ہی سمجھتا رہا تھا۔" ان کا چہرہ اجنبی احساسات اور بے نام جذبات کی آماجگاہ بن گیا۔ ان کی بھرائی آواز میں ان کی زندگی بھر کا درد اپنی تمام تر شدّت کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ایک لمحے کا سہارا لیا پھر بولے۔

"بیٹا! تم سوچتے ہو گے کہ وہ میرا واہمہ تھا۔ اگر میں اپنی آنکھوں سے اُس منظر کو نہ دیکھتا تو یقیناً یہی کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا مگر...."

اِس کے آگے بھی انہوں نے بہت کچھ کہا تھا مگر اس وقت جیسے میں کسی اور دنیا کی راہوں کا بھٹکا ہوا مسافر بن چکا تھا۔ ان کی باتیں میری سماعت سے ٹکراتی تو رہیں مگر اُن کا مفہوم سمجھنے سے جیسے میں قطعاً قاصر تھا ——— میں جانتا تھا وہ کس منظر کی بات کر رہے تھے مگر میرے لاشعور میں دبکے ہوئے نامعلوم خوف نے جیسے اُس لمحے میری قوّتِ گویائی کو سلب کر لیا تھا۔ لاکھ پوچھنے کی خواہش کے باوجود میں اُس منظر کی تفصیلات اُن سے نہ پوچھ سکا جو موت کے بعد بھی اُس کی آنکھوں میں بھرپور توانائی کے ساتھ زندہ تھا!!
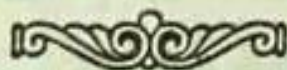
بے شناخت

زندگی روشنیوں کے اس شہر میں بہتے ہوئے دریا کی طرح رواں دواں ہے۔
امن وامان کا دور دورہ ہے۔ راتیں جوان اور دن زندگی کی لطافتوں کے ترجمان ہیں! آئینوں کی طرح شفاف طویل شاہراہوں پر خوبصورت کاروں کی ریل پیل، مقامی بازاروں میں خریداروں کا جم غفیر، ریستورانوں اور ہوٹلوں میں زندہ دلوں کی بھیڑ، پھولوں سے سجے سجائے پارکوں میں اور سمندر کے کنارے سیر گشت کرتے ہوئے لاتعداد نوجوان جوڑوں کی محبت بھری سرگوشیاں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ شہر کی جوانی نقطۂ عروج پر پہنچ کر تھم گئی ہے — یہ میرا شہر ہے جو دنیا کے کسی بھی خوبصورت شہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے تابناک حسن کو شرمندہ کر سکتا ہے۔ اسی شہر کی جوانی کا عکس میری سوچوں پر بھی مرتسم ہے!

اور پھر اسی شہر میں ایک دن جب میرے پڑوسی، میرے بچپن کے دوست نے گوہرِ مقصود کی تلاش میں ایک دور افتادہ ملک جانے کی تیاریاں مکمل کر لیں تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔

"یہ شہر زندگی کے بوقلموں پہلوؤں کا عکاس ہے۔" میں نے اپنے دوست کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم جس شئے کے حصول کے عوض غریب الوطنی کے کرب کو اپنانا چاہتے ہو۔ وہ شئے، وہ تمہارا آئیڈیل تم کو اسی شہر کے کسی کونے میں مل جائے گا۔"

"میں سکون کے جس گریزپا لمحہ کا متلاشی رہا ہوں وہ مجھے کبھی نہیں ملا۔" اس کا لہجہ قنوطیت کا مظہر تھا۔

"سکون کوئی گاجر مولی نہیں کہ سبزی کی دکان پر برائے فروخت ہو۔" میں نے اس گمراہ کو راہِ راست پر لانے کے لئے منطق کا سہارا لیا۔ "اگر تلاش کا جذبہ صادق ہو اور انسان اپنا دیدہِ دل وا رکھے تو بیروان پیپل کی چھاؤں میں سستائے ہوئے بھی مل سکتا ہے۔"

اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے میں سمجھ گیا کہ میری بات کا اس پر منفی اثر ہوا ہے۔ میرا کیش خیالِ خاطرِ احباب ہے۔ نازک آبگینوں کو ٹھیس لگانے کا میں قائل نہیں۔ بس میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بات کو مزید آگے نہ بڑھاؤں۔

مگر بات اس موڑ پر پہنچ ختم نہیں ہوئی۔ اس کے دل کے زیریں پرتوں میں جو لاوا پک رہا تھا شائد اس کو باہر نکلنے کے لئے راستے کی تلاش تھی۔ میانہ روی جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھی یکلخت اُس سے جدا ہو گئی اور غصہ اس سے بغلگیر ہوا تو اس کا چہرہ آگ سے دُھل کر پھولی ہوئی شفق کا منظر پیش کرنے لگا۔

"تم جس شہر کی تعریف میں قصیدہ خواں ہو تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اس پر کون سی بلائیں، کون سے آسیب شب خون مارنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔" میں نے دیکھا کہ اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ "میرے نزدیک تم سب شہر والوں کی حیثیت غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے خوش نصیب بیوقوفوں سے کم نہیں۔ تم لوگ طوفان سے پہلے کی خاموشی کو سکون کہتے ہو۔ جب بلائیں تمہارے گھروں کو جلا کر ان کی آگ میں تمہارے گھر والوں کو پھینکیں گی تو ممکن ہے اس وقت تمہاری آنکھیں کھل جائیں۔ دیدہِ دل وا کرنے کی ضرورت مجھ کو نہیں تم کو ہے۔"

اب مزید بحث کی گنجائش ممکن نہ تھی۔ بحث برائے بحث خوشگوار دیرینہ تعلقات کو بگاڑ سکتی ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی دوستی سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ اس بار مجھے خاموش دیکھ کر اس نے بھی اس موضوع کے بخئیے ادھیڑنے کی کوشش نہیں کی اور یوں بات آئی گئی ہو گئی!

خدا معلوم وہ کن بلاؤں، کن آسیبوں کے ذکر سے مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا

تھا۔ یوں ہی اُڑتی اُڑتی ایک خبر میں نے سن لی تھی کہ اس کے ذاتی مسائل کی پیچیدگیاں اُس کے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ شائد یہ بہکی بہکی باتیں اُس کے منفی حالات کا شاخسانہ تھیں جن کے شکنجے میں پھنس کر وہ ایک نو گرفتار پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا! میں نے اپنا دستِ تعاون اُس کی جانب بڑھانے کی بابت سوچا مگر چونکہ میں اس کی اَنا پرست طبیعت سے خوب واقف تھا لہٰذا بہتری اس میں تھی کہ اس کو خول سے گھسیٹ کر باہر نہ لاتا!

اور پھر وہ چلا گیا۔ اس کی روح کے پاتال میں اندھیرے جاگزیں تھے۔ وہ اس روشنی کا متلاشی تھا جو اس کو روشنیوں کے اس جگمگاتے شہر میں کہیں نہ مل سکی تھی اور شایدیہی وجہ تھی کہ اس نے وطن کی مٹی کو تیاگ کر اجنبی ملک کے دور افتادہ گوشے میں سکونت کو ترجیح دی۔ ایک موج کے کم ہونے سے دریا کی روانی میں فرق نہیں آتا۔ زندگی روشنیوں کے اس شہر میں بہتے ہوئے دریا کی طرح رواں دواں تھی اور رواں دواں ہی رہی۔ میرے شہر کی جولانیاں سب کے لئے نغمات اور خوشبوؤں کی سوغات مہیا کرتی رہیں ——

شروع شروع میں اس کے گھر والوں کی زبانی اس کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی۔ انہیں سے مجھے معلوم ہوا کہ نئے ملک کی نئی فضائیں اس کے لئے نئی زندگی کا آدرش ثابت ہوئی ہیں۔ وہ زندگی کی لذتوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس کی روح پر فرسٹریشن کی جو تلوار لٹک رہی تھی اب وہ مہکتے پھولوں سے لدی ہوئی ایک شاخ بن کر اس پر خوشبوئیں نچھاور کر رہی ہے۔ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے دبیز اندھیروں نے دم توڑ دیا تھا اور اس کا گوہرِ مقصود اُسے حاصل ہو گیا تھا! دوست کی زندگی کے سنورنے سے کون خوش نہیں ہوتا ہے؟ یوں تو میں بھی بے حد خوش ہوا مگر میری اس خوشی میں تھوڑا سا دکھ بھی شامل تھا —— میرے دوست کو سکون کا جو گریزپا لمحہ غریب الوطنی میں ملا تھا کاش وہ اسے اسی شہر کے کسی کونے میں مل جاتا!! میں نے اس ایک بات کے متعلق سوچا اور بارہا سوچا!

انہیں دنوں مجھے اس کا ایک خط ملا جس کی ہر سطر میں اس کی بیکراں جذباتی خوشی نمایاں

طور پر اچھل کود رہی تھی۔ یہ خط در اصل نئے وطن کے کوائف اور نئے دوستوں سے مجھے متعارف کرانے کی ایک کوشش تھی۔ ایک جگہ اس نے لکھا۔

"نئی زمین سے رشتہ جوڑ کر میں نے جیسے مابعد الطبیعاتی مسرتوں کو اپنایا ہے۔ اب میری زندگی میرے گمشدہ خوابوں کی بازیافت کا ایک مرحلہ ہے۔"

میں نے جوابی خط کے ذریعہ مبارکباد دینے اور اپنی نیک خواہشات پہنچانے کے متعلق متعدد بار سوچا مگر زندگی کے ہنگاموں اور پھر میری سست گام فطرت نے چند سطور لکھنے کی بھی مجھے مہلت نہ دی۔ اگرچہ میں اس کی خوشیوں سے بھرپور نئی زندگی پر بے انتہا خوش تھا مگر نہ جانے کیوں اس کے یوں نئی زمین سے رشتہ جوڑنے کے فیصلہ نے مجھے ہنوز کوئی تسلی بخش جواز پیش نہیں کیا تھا! ——— اور پھر اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔ کارِ جہاں دراز کی مصروفیات نے زندگی کو یوں گھن چکر کر دیا تھا کہ میری یادداشت کے شیشے پر اس کی شبیہہ دھندلی ہوتی ہوئی جیسے مٹ سی گئی!!

اور پھر ایک دن جب اس شہر کے باسی خوابِ غفلت سے جاگے تو شہر کا سہاگ اُجڑ چکا تھا! نہ معلوم کس بدبخت کی منحوس نظر اس عروس البلاد کے ساحرانہ حُسن کو لگ گئی تھی کہ اس کے جوبن اور رعنائیوں کو سرِ عام لوٹ لیا گیا! ہوا کا رخ بدلا تو یک بیک بادوباراں کا طوفان موت کا پیغامبر بن کر گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے لگا ——— میرا شہر جو شہرِ طلسمات کی مقناطیسی کشش سے مرصع تھا اچانک ایسے قبرستان کی ہولناکیوں کا مرکز بن گیا جہاں بے چین روحیں مسلسل گریہ وزاری میں مصروف رہتی ہیں! جن فضاؤں میں خوشبوؤں کا جادو جاگا کرتا تھا اب اُن میں بارود کی مہلک بُو بھی شامل ہو گئی۔ نغمات اور موسیقی نے دم توڑا تو پٹرول بموں کے گھن گرج دھماکے اور شکار کی تلاش میں چھٹنے والی گولیوں کی سنسناہٹیں ذہنوں میں خوف کی یخ بستگی کا سبب بننے لگیں ——— آگ اور

خون کی ہولی دیکھتے ہی دیکھتے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ نفرتوں کا زہر دور دور تک پھیل گیا۔ وہ لوگ جو اس شہر میں محبت اور آشتی کے ساتھ رہتے تھے، اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن چکے تھے۔ خون ریز ہنگاموں اور تشدّد کا زور بڑھتا گیا۔ نامعلوم مسلح افراد نے آزادانہ طور پر قتل و غارتگری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ دکانوں اور مکانوں کو نذرِ آتش کر کے زندہ افراد کو آگ کے شعلوں میں پھینکا جا رہا تھا۔ تمام علاقوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ انسان انسان سے خوفزدہ تھا ـــــ میرا شہر جو کبھی روشنیوں کا شہر تھا اب اس پر ماتمی اندھیرے چھا گئے تھے۔ سڑکوں کی رونق اور چہل پہل ختم ہو گئی تھی اور قبرستانوں کی گہما گہمی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا!!

ایک دن حسبِ سابق جب میری کار آفس کی طرف فراٹے بھر رہی تھی کہ اچانک ونڈ اسکرین بھیانک آواز کے ساتھ پاش پاش ہو گیا۔ شیشے کی بے شمار کرچیوں نے بھوکے گدھوں کی مانند مجھ پر حملہ کر دیا۔ اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی مگر میں نے بمشکل ہوش و حواس کو رخصت ہونے سے روکا ـــــ سڑک کے ایک طرف نوجوانوں کا غولِ بیابانی آتشی ہتھیاروں اور تباہ کاری کے ساز و سامان سے لیس پتھروں کے ڈھیر کے قریب کھڑا اپنی کامیابی پر شاداں و فرحاں نظر آ رہا تھا۔ لمحہ بھر بھی وہاں رکنا ایک مہلک غلطی ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے دیکھا چند نوجوان کار کو گھیرے میں لینے کی غرض سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ مگر میں نے ان کے تیور دیکھ کر اُن کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میری کار برق رفتاری سے ایک تنگ گلی میں گھس گئی۔ اب میں بدحواسی کی حالت میں واپس گھر جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا عجیب افراتفری اور انتشار کا عالم ہے۔ میرے چاروں طرف شیطانی قوتوں کا مکمل قبضہ تھا۔ سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کو زبردستی روک کر نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ مکانات جل رہے تھے۔ دکانیں جل رہی تھیں اور جہاں تک نظر اٹھتی دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا بھاگتے ہوئے راہگیروں پر اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ بموں کے دھماکے ہو رہے تھے اور سڑکیں میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔

گھر پہنچا تو محسوس ہوا کہ موت کو دھوکہ دے کر واپس آ گیا ہوں۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ بیوی نے میرا خراشوں سے بھرا ہوا چہرہ اور میری نروس کیفیت کو دیکھا تو سکتے کا شکار ہو گئی۔

"فکر نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔" میری آواز سن کر بھی جب وہ بت بنی گھورتی رہی تو مجھے مزید کچھ کہنا پڑا۔ "بس کوئی خاص بات نہیں۔ میری کار کا ونڈ اسکرین ٹوٹ گیا تھا۔ تم ذرا جلدی سے فرسٹ ایڈ کا بکس لے آؤ" ——— چند لمحوں بعد جب میں زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھا تو اچانک میرے ذہن کے اُفق پر ایک خیال شہابِ ثاقب بن کر نمودار ہوا اور دور تک پھلجھڑیاں چھوڑتا ہوا معدوم ہو گیا۔ اب میں غیر یقینی حالات کے دوراہے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کس راستے پر چل کر مجھے منزل کا سراغ مل سکتا ہے۔ میری الجھن دو چند ہوئی تو مجھے اپنے اطراف کی ہر شئے تصوراتی پیکر کی طرح نامعتبر سی دکھائی دینے لگی!!

فسادات اور بلوؤں کا زور کم ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شہر کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور ہر گھر کی چہار دیواری بیرونی خطرات سے غیر محفوظ ہو چکی تھی ——— ایک کرفیو زدہ رات کو جب ہم بموں کے دھماکوں کے ساتھ دور سے آنے والی انسانی چیخ و پکار اور کلاشنکوف کی آوازیں سن رہے تھے تو میری بیوی یوں محتاط انداز میں گویا ہوئی جیسے ڈرتی ہو کہ ہونٹوں کی جنبش سے الفاظ ٹوٹ نہ جائیں۔

"مجھے لگ رہا ہے جیسے ۸۴ء کی آگ پھر سے بھڑک اُٹھی ہے۔" اُس کے لہجے میں نامعلوم خدشات سر اٹھا رہے تھے۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا سہما ہوا چہرہ خوف کے ہر پہلو کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ میں نے چاہا کہ جھوٹی تسلّی کے دو جھوٹے بول اُس کے کانوں میں اتار دوں مگر باہر سڑکوں پر کھیلی جانے والی آگ اور خون کی ہولی نے مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ اور میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ سر ہلا کر اُس کی بات سے اتفاق کروں ——— وہ یک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اگرچہ اس کی آنکھوں کی تحریر کو میں پڑھنے سے قاصر تھا مگر اتنا

ضرور جان گیا کہ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی ہے:

"ان حالات میں تمہارا تذبذب بے معنی ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا: "تم بِلا روک ٹوک مجھ سے ہر بات کہہ سکتی ہو۔ جو شخص آٹومیٹک کلاشنکوف کی مکروہ زبان تحمل کے ساتھ سن سکتا ہے، اس کی سماعت پر کوئی بات گراں نہیں گزر سکتی۔" میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر اس کی گمشدہ جرأت کی بھٹکتی ہوئی رمق لوٹ آئی ہے۔ اب میں اس کی آنکھوں کی اندھیری سرنگوں میں کہیں دور جگنوؤں کی نھری نھری چمک کو دیکھ سکتا تھا!

"تمہیں معلوم ہے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے دوران ہمارے بزرگوں نے کیا قدم اٹھایا تھا!" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ میں نے بڑی بے یقینی کے ساتھ اسے دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں کی تحریر کا مفہوم مجھ پر واضح ہو چکا تھا۔ اچانک میرا چہرہ حیرانی کی آماجگاہ بن گیا مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ ایسی کوئی بات سوچ بھی سکتی ہے کہنا تو بہت دور کی بات ہے!

"تم ترکِ وطنی کی بابت سوچ رہی ہو؟" میں نے تعجب خیز انداز میں پوچھا اور جواباً اس نے فوری اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"تم زبان سے چاہے کچھ نہ کہو مگر میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ دل ہی دل میں تم بھی یہی کچھ سوچ رہے ہو!" اس کے لہجے کی قطعیت کو محسوس کر کے میں دنگ رہ گیا۔ میں نے چاہا کہ اس کی اس بات کی بہ آوازِ بلند تردید کروں۔ مگر جب میں نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تو پھر نفی میں کچھ کہنے کی جرأت مجھ میں بالکل نہ تھی:

اپنی زمین اپنی مٹی کو چھوڑنے کا تصور تکلیف دہ سہی مگر انسانی وجود کی طرح پرانا بھی ہے! اپنوں اور غیروں نے جب بھی ستم کے پہاڑ توڑے انسان اُس زمین سے رشتہ توڑنے پر مجبور ہو گیا جس کی خمیر کی خوشبو اس کے خون میں رچی بسی تھی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی گواہی تاریخ کا ہر باب دے سکتا ہے! —— میری بیوی کا خیال غلط نہ تھا۔ فسادات اور مختلف گروہوں کی مسلسل خونی جھڑپوں نے مجھے سنجیدگی سے نقل مکانی کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں مختلف اقدامات

کے علاوہ اپنے بچپن کے دوست کو بھی لکھا تھا کہ وہ میری معاونت کرے۔ میں چاہتا تھا کہ اس بات کو اس وقت تک اپنی بیوی پر آشکار نہ کروں جب تک کوئی خوش آئند نتیجہ سامنے نہ آجائے۔ مگر اب جبکہ وہ اس موضوع کے بخیئے ادھیڑنے پر تل گئی تھی تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ہر بات اس کے گوش گزار کردوں۔ اگر ان غیر تسلی بخش حالات میں کسی بات سے اس کی تسلی ہوسکتی ہے تو کیا مضائقہ ہے؟

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے دوست اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کریں گے؟" جب وہ میری بات صبر و تحمل سے سن چکی تو ایک عجیب و غریب سوال سے مجھے متعجب کردیا۔

"کیوں نہیں؟ وہ یقیناً ہماری مدد کرے گا۔ وہ میرا بہت پرانا دوست ہے۔" میرا لہجہ تیقن سے بھرپور تھا۔ "تمہیں یاد نہیں چند ماہ قبل اس نے اپنے خط میں مجھے نقل مکانی کا مشورہ دیتے ہوئے اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔"

"وہ چند ماہ قبل کی بات ہے۔" میری بیوی ہنوز تشکیک کی مریضہ بنی ہوئی تھی۔ "اب تو حالات تیزی سے بدلتے جارہے ہیں۔"

"اس بات کا حالات بدلنے سے کوئی تعلق نہیں۔ تم تو خواہ مخواہ لوگوں کی نیت پر شک کرتی ہو۔" مجھے اپنی بیوی کی بات اچھی نہیں لگی تھی اور میرا موڈ بُری طرح آف ہوگیا تھا۔

"ناراض ہونے کی ضرورت نہیں" وہ آہستگی سے بولی۔ "پہلے تم میری پوری بات سن لو ممکن ہے اس کے بعد صحیح صورت حال تم پر واضح ہوجائے!"

"پوری بات! کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو جلدی سے کہو مجھے پہیلیاں بجھوانے سے سخت نفرت ہے۔"

"مجھے بھی پہیلیاں بجھوانے کا کوئی شوق نہیں۔" اس بار اس کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔ "بس سوچ رہی تھی کہ یہ بات تمہیں معلوم کیوں نہیں؟"

"کون سی بات؟ پھر وہی۔۔۔۔"

"بس زیادہ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔" اُس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے

سے روک دیا اور بلا تاخیر اصل مطلب کی طرف آگئی۔

یہ واقعہ میرے بچپن کے دوست سے متعلق تھا جس کی الف لیلوی تفصیل اس کے گھر کی چند عورتوں نے میری بیوی کے گوش گزار کیا تھا۔ واقعہ کا پس منظر کچھ ایسا ڈرامائی اور پُراسرار تھا جیسے ازمنۂ قدیم کی کوئی ماورائے عقل داستان دہرائی جارہی ہو! اس کا لب لباب کچھ یوں تھا۔!!

شروع شروع میں میرا دوست نئے وطن کی عطر بیز فضاؤں میں زندگی کی بیکراں لطافتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ یہاں اُس کو اتنا کچھ مل گیا تھا کہ اسے کوتاہیِ داماں کی شکایت ہوگئی تھی۔ زندگی گزارنے کا جو تصوّر اس کے ذہن میں تھا اُس کے اردگرد کی زندگی اُس سے کہیں زیادہ حیات آفریں تھی۔ چھوٹے بڑے عملی تجربات سے گزرتے ہوئے اس کے ذہن کا اُفق وسیع تر ہوتا جارہا تھا۔ نئے دوستوں کی قربت میں وہ پرانے دوستوں کے دیئے ہوئے غم بھول رہا تھا۔ یہاں ماحول آزاد تھا۔ فضائیں آزاد تھیں اور اس کی حیثیت ایک آزاد پنچھی جیسی ہوگئی تھی۔ ماضی کی طرح قدم قدم پر نہ پہرے تھے اور نہ شکاری شکار کی تلاش میں جال پھیلائے کمیں گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے! اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگ آپس میں امن و آشتی کے ساتھ رہ رہے ہیں اور سب علاقائی اور غیر علاقائی تعصبات سے بے نیاز ہیں!!

مگر اُس کے خوش آئند احساسات کی عمر بڑی مختصر تھی۔ اور پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ اچانک نشاط و نور کے یہ جگمگاتے ہوئے دن سراب کا دوسرا روپ ثابت ہوئے۔ اسے محسوس ہوا کہ زندگی مثبت تبدیلیوں کے روپ میں اس کے لئے نئی پریشانیوں کا سامان لائی ہے۔ وہ اب تک جو کچھ دیکھتا آیا تھا در اصل سرابوں کا نظارہ تھا اور جو کچھ وہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا شاید وہ بھی دھوکہ تھا!! ——— ایک نامعلوم خوف تھا کہ پیرِ تسمہ پا بن کر اُس کے دل و دماغ پر مسلط ہوگیا۔ اس کے اردگرد رہنے بسنے والے لوگ پُراسرار منفی قوتوں کی طرح اُس کے اعصابی نظام کو متاثر کرنے لگے۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کا

تعاقب کیا جا رہا ہے۔ شائد اس کے گھر کی نگرانی بھی کی جا رہی تھی کیونکہ اس نے بار ہا چند مشتبہ افراد کو مشکوک انداز میں گھر کے قریب ٹہلتے ہوئے پایا تھا۔ دن میں کئی بار دروازے پر دستک ہوتی اور جب وہ دروازہ کھولتا تو باہر پرچھائیوں اور پُر ہول سناٹوں کے سوا کچھ نہ ہوتا! اور پھر کئی بار فون پر نامعلوم افراد نے اُسے موت کی دھمکیاں بھی دی تھیں! معلوم یوں ہو رہا تھا جیسے ساری خدائی اس کی جان کے درپے ہے۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کو کس جرم کی پاداش میں یوں قسطوں میں مصلوب کیا جا رہا تھا۔ زندگی کے نئے معانی سمجھنے میں شائد ایک بار پھر اس سے سنگین غلطی ہو گئی تھی!!

انسانی مزاجوں کا موسم بدلا تو جیسے سب کچھ بدل گیا۔ نئے دوستوں کی دوستی اور گرمجوشی جیسے گمشدہ وقت کی بھولی بسری کہانی بن کر یاد آنے لگی۔ اب اُن کے دوستانہ انداز اور انسانیت نواز خلوص کے پس منظر میں یخ بستہ لاتعلقی کے سواء کچھ نہ تھا۔ نہ معلوم شہر کے مزاج کو کیا ہو گیا تھا کہ اب لوگ فاصلے سے ملتے ہوئے بھی گھبرانے لگے تھے!! —— ایک بار کسی مذہبی تقریب کے سلسلے میں جب اس کے علاقہ کے لوگ جمع ہوئے تو اس نے دبی دبی زبان سے چند لوگوں کے سامنے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بیان کئے۔ انہوں نے اُس کو بات ختم کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا اور زور زور سے ہنسنے لگے جب اس نے تحیّر کا اظہار کیا تو ان کے قہقہے وحشیانہ انداز اختیار کر گئے۔ اس نے چاہا یا تو کسی کا ٹیٹوا دبا دے یا پھر اپنا ہی سر دیوار سے ٹکرانا شروع کر دے۔ مگر اس کی نوبت نہ آسکی۔ ایک جہاندیدہ شخص جس کے چہرے پر گہری متانت کا غلاف چڑھا ہوا تھا، اس کو ایک کونے میں لے گیا۔

"یہ تمہاری نہیں ہم سب کی کہانی ہے!" اس کا لہجہ بھی بے حد سنجیدہ تھا۔

"آپ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے؟" میرے دوست نے استعجاب سے پوچھا۔

"نہ صرف ہو رہا ہے بلکہ ہوتا آرہا ہے!" سنجیدہ شخص بولا "میں پچھلے بیس برسوں سے یہاں ہوں اور مجھے یاد نہیں کوئی ہفتہ ایسا بھی گزرا ہو جب مجھے کسی مقامی شخص نے گالی

نہ دی ہو یا دھمکی نہ دی ہو۔"

"اور اس کے باوجود آپ بیس برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں؟" میرے دوست کی حیرانی دوچند ہو رہی تھی۔

"کیا مضائقہ ہے؟ یہاں مجھے وہ سب کچھ حاصل ہے جس کا میں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔" سنجیدہ شخص بے نیازی سے بولا۔ "تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ مہذب لوگ ہیں۔ صرف گالیاں اور دھمکیاں دیتے ہیں۔ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ان کی عادت نہیں۔" سنجیدہ شخص نے جب دیکھا کہ اس کی باتیں میرے دوست کے سر پر سے گزر رہی ہیں تو وہ ناصحانہ انداز میں اسے سمجھانے لگا۔

"سنو میرے دوست! ان لوگوں کی حیثیت اُن بھونکنے والے کتّوں کی طرح ہے جو کاٹنا بالکل نہیں جانتے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ تمہیں یہاں زندگی کے نادر تعیشات میسّر ہیں۔ اگر کوئی دل جلا تمہیں کچھ کہہ بھی دیتا ہے یا تمہارے باب میں سرد مہری کا رویّہ اختیار کرتا ہے تو تمہاری صحت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑنا چاہیئے ———— اور پھر یہاں اچھے لوگ بھی تو ہیں۔ مانا اُن کی تعداد کم سہی۔"

"مگر میری اپنی پہچان، میرا ذہنی سکون ———— میں یہ چیزیں کہاں تلاش کروں جن کو حاصل کرنے کی خاطر میں نے زمین سے رشتہ توڑا تھا!"

میرا دوست فلسفہ موجودیت کا بے بس پیکر بنا زندگی کے نئے معانی و مفاہیم تلاش کرنے لگا! اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے اردگرد یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ اُس کے ذہن کا اندھیرا دبیز ہوتا گیا اور اس کے سامنے کھڑا سنجیدہ شخص اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی بے دال کا بودم ہو!!

جب میری بیوی سارا واقعہ سنا چکی تو مجسّم سوال بن کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں؟ جب میری خاموشی کا سلسلہ دیر تک ٹوٹ نہ سکا تو شائد اس نے سمجھ لیا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ لہٰذا گفتگو جاری رکھنے کے لئے وہ

گویا ہوئی۔

"تمہارا خیال ہے وہ ان حالات میں بھی تمہارے خط کا جواب دیں گے؟"

"اس کا جواب اگلے چند روز میں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے پُر خیال انداز میں سر ہلا دیا۔

اور پھر کوئی دو ہفتے بعد مجھے اُس کا ایک رجسٹرڈ خط ملا۔ کافی طویل خط تھا اور اس میں اُس نے وہ سارے حالات تفصیل سے قلمبند کئے تھے جو میں اپنی بیوی سے پہلے ہی سن چکا تھا۔ اُس کے خط کا لہجہ بڑا افسردہ کن تھا۔ ایک ایسے مضمحل انسان کے احساسات کا عکاس جس نے نا امیدیوں سے ابدی رشتہ جوڑ لیا ہو! ایک جگہ اس نے لکھا۔

"پرانی زمین سے رشتہ توڑ کر جیسے میں نے مابعد الطبیعاتی دنیا سے رشتہ توڑا ہے۔ میرے مزاج اور نئی زمین کے باسیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگرچہ اپنی زمین پر میں سکون کے گریز پا لمحوں کا متلاشی تھا مگر وہاں میرا اپنا تشخص تھا۔ اپنی پہچان تھی۔ یہاں میں تلاش کے باوجود سکون کے گریز پا لمحوں کو حاصل نہ کر سکا ہوں اور دوسری اذیت ناک بات یہ ہے کہ انجانے لوگوں کی بھیڑ میں اپنی پہچان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔"

اس کے بعد خط میں اس نے وہ تمام رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات لکھے جو اس کے ساتھ پیش آتے رہے تھے۔ خط کے آخر میں اس نے لکھا۔

"نقل مکانی کے جتنے فائدے ہو سکتے ہیں، زمین چھوڑنے کے نقصانات بھی اتنے ہی ہیں۔ یہ ایک ایسا کاروبار ہے جس میں خالص فائدہ نام کی کوئی چیز نہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں زمین چھوڑنے کا مشورہ بالکل نہیں دوں گا ——— اگر انجانی زمین پر انجانے لوگوں کے درمیان انجانی بلاؤں سے مقابلہ ایک اٹل حقیقت ہے تو بہتر یہی ہے کہ انسان اپنی زمین پر اپنے لوگوں کے درمیان نامعلوم سمتوں سے آنے والی آسیبی قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔

ایسے مقابلے میں ممکن ہے وہ اپنا سب کچھ ہار جائے مگر اس کی اپنی پہچان کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا!!"

زندگی کے باب میں میرا نقطۂ نظر میرے دوست کے نقطۂ نظر سے ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ ماضی میں اس نے میری تقریباً ہر بات سے اور میں نے اس کی تقریباً ہر بات سے اختلاف کیا تھا۔ مگر خط پڑھ کر میں نے پہلی بار اس کے اس مخصوص نقطۂ نظر کو قبول کیا اور نقل مکانی کا ارادہ ترک کر دیا!!
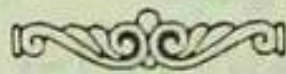
لوگ کہتے ہیں

ضروری تو نہیں کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہیں!

لوگوں کو تو جیسے بولنے کا بہانہ چاہیئے۔ کوئی موضوع ہاتھ آیا اور یہ بخیئے ادھیڑنے یوں لپکے جیسے بھوکے گِدھوں نے لاش دیکھی اور نوچنے کھسوٹنے لگے!! آخر پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانا کس رُو سے جائز ہے؟ دوسروں کے معاملات میں دخل درمعقولات کی عادت میرے نزدیک ایک مہلک مرض کے مماثل ہے اور اس مرض کے خطرناک جراثیم کسی وقت بھی وَبا کی شکل میں پھیل سکتے ہیں۔ ایک راز کے تار و پود بکھر جاتے ہیں تو بات زبانِ زدِ خاص و عام ہو ہی جاتی ہے!! اپنے باب میں بھی میں نے یہی کچھ محسوس کیا تھا!

کافی عرصے پہلے کی بات ہے محبّت کا مرض مجھے بھی لاحق ہوا تھا مگر اس مرض نے مجھے حقیقی تندرستی کی لذّت بخشی تھی ۔ جب تک میں محبّت کی چاشنی سے محروم تھا، نروس بریک ڈاؤن نے مجھے حال سے بے حال کر دیا تھا۔ زندگی کا قافیہ جیسے تنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ صحت کا خزانہ بیماری کے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا اور میں بڑی سنجیدگی سے کسی عظیم المرتبت فلسفی کی طرح فلسفۂ موت کا مطالعہ کرنے لگا تھا مگر اس ویران زندگی کے سنسان موڑ پر فرزانہ مجھ سے آکر ٹکرائی تو جیسے نامساعد حالات کے اُفق پر ایک خوشگوار تبدیلی کا سورج طلوع ہو گیا ہو! بیماری تو دور کی بات، بیماری کا احساس بھی نو دو گیارہ ہو گیا۔ زندہ رہنے کی اُمنگیں میرے ناتواں جسم میں یوں رقصاں ہوئیں جیسے متلاطم سمندر کے سینے پر لہریں!! منفی احساسات کے گھروندے ڈھے گئے۔ ایک خوبصورت لڑکی زندگی بن کر سامنے آجائے تو موت کے متعلق سوچنے کی مہلت کسے ملتی ہے!

وہ میری پڑوسن تھی اور ایک پڑوسی کے حقوق ادا کرنا خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ زندگی اُس کے نزدیک ایک مہکتا ہوا پھول تھی جس کو وہ میرے لبوں پر کھلتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اور جب وہ میری ذات کا جزو لاینفک بنی تو میں نے محسوس کیا کہ زندگی جان کا جنجال نہیں بلکہ ایک ایسی مہ وش حسینہ ہے جس کے طنطنوں اور رنگین اداؤں کے روپ میں مسیحائی کے سارے رموز پوشیدہ ہیں۔ میری متانت و سنجیدگی کو جو مسلسل جان لیوا بیماری کی رہینِ منت تھی، دیکھ کر وہ کہتی۔

"ارے نادر! تم تو رو رہے ہو۔"

"مم.... میں —" میں یکبارگی بوکھلا جاتا۔ "نہیں تو...۔"

"چی چی چی —" وہ اظہارِ تاسف کے انداز میں کہتی "تو تم رو نہیں رہے ہو؟"

"نہیں مگر.... —"

"اوہ! تو پھر تمہاری صورت ہی ایسی ہے۔" وہ کھنکھناتا ہوا قہقہہ لگاتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری روح کو پیاس کے صحرا میں اچانک گیتوں کا چشمہ مل گیا ہو۔ پھر وہ جاپان کے حسین قومی پھول سکورا کی طرح مسکرا کر کہتی۔ "نادر! خدا کے لئے اپنی روح پر سے سنجیدگی کا یہ بوسیدہ غلاف اتار پھینکو۔ زندگی کھنکتے قہقہوں کا ایک راگ ہے اُسے ماتمی احساسات کی لَے سے ہم آہنگ مت کرو۔"

اس کے لہجے میں اتنا وزن ہوتا کہ بے اختیار مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کائناتی رہگزاروں میں زندگی سانس لیتی ہوئی پھیلتی جا رہی ہو۔ کیف افزا مسکراہٹ ایک زبردست مقناطیسی کشش کے تحت کھنچتی ہوئی میرے لبوں پر جلوہ فگن ہو جاتی۔

"ہاں! اسی طرح مسکراؤ — اور.... اور — اور"

اور پھر ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیتے۔

دونوں گھروں کی چھتیں ہمارے دلوں کی طرح آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ جس طرح ذہن کے گوشوں میں ایک بے حد رومان انگیز خواب کی پرچھائیاں پھیل جاتی ہیں اسی طرح جب شام

کے سائے فضاؤں میں پھیل جاتے تو اُس کا حُسن ایک زریں چراغ بن کر میرے سامنے چھت پر روشن ہو جاتا۔ بام کی روشنی پستیوں کی سیاہیوں کو بھی دور کر دیتی۔ اور تب رخصت ہوتی ہوئی شام بھی ایک بار مڑ کر اُسے اپنے شفق گوں ہاتھوں سے سلام کرتی اور مغربی اُفق کے پاکیزہ مصلّے پر سجدہ ریز ہو جاتی!! اُس کا لباس بیش قیمت ہوتا۔ بے حد بھڑکیلا ـــــ بے حد معطّر! مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے خوشبوؤں میں رچے بسے تمام تر وجود کی دل ربائی کے ساتھ دنیا والوں کو پاگل کر دینے کے بہانے تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے آتشیں پیکر سے سحر انگیز نور کی شعاعیں پھوٹتیں اور میری روح میں بالیدگی اور وسعت پیدا ہو جاتی۔ ایک ہمہ گیر احساس کی رعنائی بڑھ کر میرے دل سے یوں معانقہ کرتی جیسے مدتوں بعد ایک بچھڑا ہوا محبوب مل گیا ہو۔ ایک ایسا احساس جس میں پوری کائنات پر چھا جانے کی چاہ پوری طرح نمایاں ہوتی۔

"یوں کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟" وہ میری بے باک نظروں کے بوجھ کو یوں آسانی سے برداشت کر لیتی جیسے یہ اس کا روزمرّہ کا معمول ہو۔ "کیا کبھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی؟"

"دیکھی ہے مگر ایسی نہیں!" مجھ پر جنوں خیز شاعرانہ وجدان کا دورہ پڑ جاتا ـــــ "مجھے تو اپنی نظروں پر پیار آ رہا ہے۔" اور وہ رومانی افسانوں کی شعلہ رو محبوباؤں کی طرح شرم وحیا سے پھول کی نازک ڈالیوں کی طرح زمیں بوس ہونے کی کوشش نہیں کرتی اور مجھے ایک نرم روسی ندامت محسوس ہو جاتی۔ جیسے اس کی بے حجابی و بیباکی وہ سب کچھ نہ تھی جس کو میں اپنے الفاظ کے ردِّ عمل کے طور پر اُس کے چہرے پر دیکھنے کا متوقع تھا!!

"فرزانہ! تم اتنی بے بیباک کیوں ہو؟ کیا تمہیں شرم ..."

مگر میں اس کے آگے اور کیا کہہ سکتا جب کہ اس کا فلک شگاف قہقہہ میری بات کو کاٹ کر شرم کی دنیا کے لئے ایک زلزلہ کا موجب بن جاتا!۔

"شرم!!" اس کے قہقہے کا گستاخانہ انداز برقرار رہتا۔ "حد سے زیادہ شرم سے ایک لڑکی کبھی عورت نہیں بن سکتی!"

لیکن ان سب کے باوجود وہ مجھے ہزار جان سے پسند تھی۔ یہ اُس کے تیکھے خدوخال کا

سحر تھا جس میں ڈوب کر میں اُس کے بے حد قریب آگیا تھا۔ محبت نے طوفانی تھپیڑوں کی طرح مجھے اچانک آلیا تھا۔ خوابوں میں میں نے اپنی باہوں پر اُس کی تصوّراتی یونانی دیوی کی باہوں جیسی باہوں کا بوجھ محسوس کیا تھا۔ میری نیندیں سرشاری و کیف سے مملو ہو جاتیں اور میں اس طرح مست شرابی کی طرح سوتا جیسے سکندرِ اعظم بابیلون کی جنگ سے پہلے گھوڑے بیچ کر سویا تھا!

محبت کا ڈرامہ بڑی شدّومد اور گرمجوشی سے کھیلا جا رہا تھا۔ اسٹیج پر پارٹ ہم دونوں کا تھا مگر اب لوگوں کو کیا کہئے کہ خواہ مخواہ اور بلا ضرورت اپنا غیر اہم پارٹ ادا کرنے اسٹیج پر آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگے اور ڈرامے کے کلائمکس میں جھول آگیا۔ خدا معلوم چشم زدن میں اتنے محبت کرنے والے خیر خواہ کہاں سے پیدا ہو گئے تھے۔ بیماری کی حالت میں تو کسی نے جھوٹے منھ بھی خیریت دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی مگر اب تو ہر ایک میرے گرد چیل کی طرح منڈلا رہا تھا۔ پند و نصائح کے پارسل اور زرّیں مشوروں کے منی آرڈر تھے کہ وصول ہوتے ہی جا رہے تھے۔ راستہ چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ میری صورت نظر آئی اور محاصرہ کر کے خیر خواہوں نے اقوالِ زرّیں کا پلندہ لگا دیا۔

”میاں کس چکّر میں پڑے ہو۔“

”یارِ خاطر نہ ہو تو کہوں کہ تم آگ سے کھیل رہے ہو۔“

”بھیّا! وہ لڑکی تھوڑی ہے چھلاوہ ہے چھلاوہ!“

”پیارے! بس اب اُس سے دور ہی رہنا ورنہ اپنی لٹیا ڈبو دو گے۔“

”ابے! کیوں اپنا بیڑا غرق کر رہا ہے!! ابھی وقت ہے ورنہ زندگی بھر روتا رہے گا۔“

لوگوں کو جو کچھ کہنا تھا کہتے رہے۔ جی تو کئی بار چاہا کہ کھری کھری سناؤں مگر پھر زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں بھی بات کو بے وجہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر غصّے کے ساتھ ساتھ مجھے حیرت بھی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ لوگ خدائی فوجدار بن کر دوسروں کے ذاتی معاملات

میں کیوں دخل انداز ہو رہے ہیں جبکہ فرزانہ اور میرے گھر والے سب کچھ جانتے ہوئے بھی آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ فرزانہ کے گھر کا کوئی فرد میرے خلاف زہر افشانی کرتا یا مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا تو اس کا کوئی منطقی جواز بھی تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ آخر لوگوں کو دوسروں کی قبر میں جھانکنے کا کیا حق تھا؟ یہاں تو قاضی جی کو شہر کا اندیشہ والی بات تھی!!

مگر میں اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھتے ہیں۔ میں تو بس یہی جانتا تھا کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں ضروری نہیں کہ ٹھیک ہی ہو۔ اور میرے معاملے میں تو اظہر من الشمس تھا کہ انگور کھٹے ہیں والی بات تھی۔ شائد انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ نوالے کو وہ میرے حلق میں نہیں اترنے دیں گے کیونکہ وہ خود اس سے محروم ہو چکے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے ہمدرد اور بہی خواہ زیادہ تر میرے ہی ہم عمر تھے اور اس عمر میں ایک ناکام عاشق ہی ناصح کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ اور تو اور میرا ایک بے حد قریبی دوست بھی ان سب کا ہمخیال تھا!

"یار نادر! خدا کے لئے فرزانہ کے خیال پر خاک ڈال!" وہ متانت کا پتلا بن کر حقِ دوستی ادا کرنے میرے پاس آگیا۔

"مگر کیوں؟" میں چیں بہ جبیں ہو کر بولا۔

"کیونکہ فرزانہ ایک کامیاب گھریلو بیوی نہیں بن سکتی۔" وہ یوں بولا جیسے ماضی میں وہ فرزانہ کو اس سلسلے میں آزما چکا ہو۔ بات بڑی احمقانہ اور طفلانہ تھی۔ جی تو چاہا جھاڑ دوں مگر جواب جاہلاں باشد خموشی کے مصداق میں خاموش ہو گیا۔

مگر ہماری محبت زیادہ دنوں تک پنپ نہیں سکی۔ شروع شروع میں تو رفتار سو میل سے بھی زیادہ تھی۔ پھر بتدریج کم ہوتی گئی اور کچھ عرصے کے بعد تو لڑکھڑا کر چلنے کی کوشش کرنے لگی۔ گرمجوشی اور انتظار کی کیفیتوں کا زمانہ گزر گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں میں عضوِ معطّل بن کر رہ گئے۔ محض ایک سائے کی طرح زندگی گزارنے کے احساس سے میں خوفزدہ ہو گیا۔ ہم دونوں شائد اس حقیقت سے واقف تھے کہ محبت اُس وقت تک نفسِ مطمئنہ ہوتی ہے جب تک دونوں طرف برابر کی آگ لگی رہے اور جب عدم دلچسپی کا آغاز

ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ ایک بار پھر سے اجنبی بن جایا جائے ـــــ اور پھر ہم دونوں از سرِ نو اجنبی ہو گئے۔ اس کے پسِ پردہ کون سے محرکات کارفرما تھے ان کو زیرِ بحث لانا بیکار ہی ہے۔

اس حادثے کو ایک عرصہ ہو گیا اور اس دوران نہ جانے کتنے نئے واقعات کا ظہور ہوا۔ کچھ دنوں بعد میرے گھر والوں نے اُس محلّے ہی کو خیرباد کہہ دیا جہاں میری محبت نے جنم لیا تھا، پروان چڑھی تھی اور صبح کے آخری ستارے کی طرح خاموشی سے دم توڑ گئی تھی ـــــ کافی عرصے بعد مجھے نہ جانے کس سے پتہ چلا کہ فرزانہ کی شادی ہو گئی۔ کہانی کبھی کی ختم ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود کبھی کبھی تخیّل ماضی کی بوقلموں تصویریں سامنے لاکر کھڑی کر دیتا اور میں یادداشت کے سہارے زندگی کے مختلف النوع واقعات کو یکجا کرکے ایک دیوار سی بنا دیتا تاکہ تخیّل کے بھرپور حملے کا مقابلہ کر سکوں۔ حال، ماضی سے یکسر مختلف تھا۔ اب میرا دامن فرزانہ کے پیار کے سجل نقوش سے تہی تھا مگر اس کے باوجود میں اس بات کو ماننے کے لئے قطعی تیار نہ تھا کہ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ ہنوز میرا یہی ایمان تھا کہ لوگوں نے جو کچھ فرزانہ کے متعلق کہا تھا وہ پتھر کی لکیر نہیں تھا۔ مانا یہ سلطانیِ جمہور کا زمانہ ہے۔ لوگ جو کچھ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے مگر جمہوریت جس کو منتخب کرتی ہے وہ عموماً اکثریت کی ایک سنگین غلطی ہوتی ہے جس کا احساس بعد میں سب کو ہو جاتا ہے!

اب میرے اور فرزانہ کے درمیان فاصلوں کی سنگلاخ دیوار حائل تھی مگر بسا اوقات ذہن اس دیوار کو پھلانگ کر اُس سے ہم آغوش ہو جاتا تھا۔ اب میری سماعت ہمدردوں اور مخلص ساتھیوں کے مخلصانہ مشوروں سے محروم تھی۔ نصیحت نامے بھیجنے والے نہ جانے کیوں مجھے اب اس قابل ہی نہیں سمجھ رہے تھے۔ وجہ محلّے کی تبدیلی نہ تھی۔ اب بھی اکثر و بیشتر پرانے چہرے نظر آجاتے تھے مگر مجھے دیکھ کر یوں چھپنے کی کوشش کرتے تھے جیسے میں اشتہاری مجرم تھا! - اب لوگوں کی آوازیں میرے گوش گزار نہیں ہوتی تھیں۔ شاید لوگوں کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہا تھا یا انہیں کہنے کی ان دنوں فرصت ہی نہ تھی یا ہو سکتا ہے کہ میرے باب میں انہیں اپنے کہنے کا خاطر خواہ نتیجہ حاصل ہو گیا تھا!!

ایک خاموش موڑ پر میں خاموش کھڑا تھا۔ میرے ہم رکاب ایک نئی زندگی تھی جو لامحدود خاموشیوں سے گھری تھی جیسے ایک اُجڑی ہوئی وادی ہو جس کو چٹیل پہاڑوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہو ــــــ اور اسی موڑ پر ایک دن مجھے پھر فرزانہ نظر آئی۔ میں نے عرصۂ دراز کے بعد اُسے دیکھا تھا مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ امتدادِ زمانہ کی دھول سے اُس کا بہار آفریں چہرہ ہنوز محفوظ تھا۔ اب بھی وہ ایک ایسی رنگین بہار کی مانند تھی جو سرسبز وادیوں میں اپنی دولت کو بے دریغ لٹاتی جا رہی ہو۔ اس کے گول، زیتون کی رنگت کے چہرے کی دلکشی و دلربائی اور انفرادیت اب بھی برقرار تھی۔ کھوکھلی حیرانی کے احساسات سے ہمکنار میں اُسے یک ٹک دیکھتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ماضی کی درخشاں کتاب کا درخشاں ورق جو وقت کی تیز ہوا کے جھونکے سے بند ہو گیا تھا، میرے سامنے دوبارہ کھل گیا ہے۔ وہ مجھ سے بے نیاز، لوگوں کی للچائی ہوئی نگاہوں سے بے خبر آہستہ آہستہ میرے قریب سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں فردا کے تابناک خوابوں کے لہریئے رقصاں تھے اور میں اُسے دیکھتے ہوئے ماضی کی شاہراہ پر پہنچ گیا تھا ــــــ اچانک ایک منحنی سے بدحال آدمی نے اس کا راستہ روک لیا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چاند پر گہن آگیا ہو!۔ اُس شخص کی حالت ایسی تھی جیسے وہ قسمت کے ہاتھوں ایک نہایت بیدردانہ قسم کی تفریح کا ہدف بنا رہا ہو! اس کے روبرو فرزانہ کا پیکر پُر وقار، طرحدار اور آتشیں معلوم ہو رہا تھا!

”اوہو! فرزانہ تم یہاں ہو۔ میں نہ جانے کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔“ وہ بڑے محتاط لہجے میں اُس سے مخاطب ہوا۔

”تم مجھے ڈھونڈ رہے تھے؟ مگر کیوں؟“ فرزانہ کا لہجہ سخت تھا اور اُس شخص کے چہرے پر روحانی کرب کے آثار ہویدا ہو گئے۔

”تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ بچوں نے سارا گھر سر پر اُٹھا رکھا ہے۔“ اُس کی آواز سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ رونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔ ”طوفانِ بدتمیزی کا بازار گرم ہے۔!“

"تم مجھے دو گھڑی شاپنگ بھی نہیں کرنے دو گے!" فرزانہ غصے سے بولی "شائد تم نے پھر بچوں کو پڑوسیوں کے حوالے کر دیا ہو گا۔ جاؤ، جا کر انہیں سنبھالو۔ میں کچھ دیر بعد آجاؤں گی۔"

جس طرح کڑوے گھونٹ کے بعد چہرے پر ایک عجیب سا رنگ بکھر جاتا ہے اسی طرح فرزانہ کی بات کا اثر اُس شخص پر ہوا۔ بات چیت کے انداز سے مجھے احساس ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ شخص فرزانہ کا شوہر ہے۔ رقیب کے لئے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا ایک غیر فطری اور بے معنی سی بات ہے مگر اس وقت اُس کی مسکینی اور قابلِ رحم حالت پر مجھے بے اختیار ترس آ گیا۔ فرزانہ نے اُسے یوں دھتکار دیا تھا جیسے کتے کو دھتکار دیا جاتا ہے اور وہ مجسم غم بنا ہولے ہولے سر جھکائے واپس جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ایک ایسی کتاب بنا ہوا تھا جس میں حسرت و یاس، پریشانی و پشیمانی اور ندامت و ملامت کی ایک دردناک کہانی کی کڑیاں بکھری ہوئی ہوں ——

وہ چلا گیا اور فرزانہ شانِ بے نیازی سے سر کو جھٹکا دے کر طمطراق سے دکان میں داخل ہو گئی۔ کچھ دیر تک میں صُمٌ بُکمٌ، حیران سا یوں کھڑا رہا جیسے ایک ناقابلِ یقین خواب کی تعبیر میرے سامنے آ گئی تھی۔ میرے ذہن کے گوشوں میں لوگوں کے وہ جملے گونجنے لگے جو ماضی میں فرزانہ کے متعلق کہے گئے تھے —— لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ میرے نزدیک ضروری نہیں کہ ٹھیک ہی ہو۔ مگر اس وقت میں حیران سوچ رہا تھا کہ فرزانہ کے متعلق لوگوں کی پیش گوئی کیونکر صحیح ثابت ہو گئی؟ کیا اس واقعہ کا تعلق مستثنیات میں ہو گا یا پھر... —— میں سوچتا ہی رہ گیا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

اگلے موڑ پر فرزانہ کا شوہر مجھے پھر نظر آیا اور تب میں نے دل ہی دل میں اُس عظیم المرتبت شخص کا شکریہ ادا کیا جو انجانے طور پر اپنی مسرّتوں کو قربان کر کے میری خاطر صلیبِ الم پر چڑھ گیا تھا!!۔

اُجالا اور اُجالا

یوں تو خلیل خان کی عمر نے بڑھاپے کی شکستہ چوکھٹ پر اپنا قدم رکھ دیا تھا۔ آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی تھی۔ چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں اور لیفٹ رائٹ کے دور کو آخری سلام کئے عرصہ دراز ہو چکا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کا دل عسکری جذبات کی آماجگاہ تھا۔ اس کا بس چلتا تو شاید وہ گھر کو ایک فوجی مرکز بنا دیتا اور گھر کے تمام افراد کو فوجی وردی پہنا کر لیفٹ رائٹ کرنے پر مجبور کرتا۔ مگر یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ تین بیٹوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کو صحیح معنوں میں وہ اپنا جانشین کہہ سکتا۔ بے شک وہ تینوں اس کی گزری ہوئی قیامت خیز جوانی کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تھے۔ چاند جیسے چمکتے چہرے، چٹان جیسے مضبوط جسم! مگر وہ سمجھتا تھا کہ اس کے سپاہیانہ جذبات کا ایک حصّہ بھی ان کے حصّے میں نہ آیا تھا۔ نئی تہذیب کی نئی روشنی میں انہوں نے جاہ وحشم تو حاصل کر لیا مگر اقبال کے مردِ مومن کی حقیقی تصویر نہ بن سکے تھے۔ بیوی کے سامنے کبھی کبھی یہ بات حرفِ شکایت بن کر اس کے لبوں پر آجاتی تھی۔

"شیروں کی ماں! مجھے تم سے بس یہی ایک شکایت ہے۔" اس کا لہجہ گمبھیر ہوتا۔ "تم نے مجھے تین بیٹے دیئے مگر کاش تمہاری کوکھ سے مجھے ایسا بیٹا بھی ملتا جو اپنے باپ کے قدموں کے نقوش کو صراط المستقیم سمجھتا۔"

"تم سمجھتے ہو کہ بہادری صرف فوجی وردی پہننے سے آتی ہے؟" اس کی بیوی بے حد متانت سے کہتی۔ "یہ تو ایک خداداد عطیہ ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے میرے تینوں شیروں کو بہادری کی دولت عطا کی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی جھرّیاں عظمت و جلال

کی روشنی میں نہاجاتیں۔ چہرے پر فرشتوں کا سا تقدس آجاتا اور اسی لمحے خلیل خان کی شکایت آخری ہچکی کے ساتھ دم توڑ دیتی۔ اس کو اپنے تینوں بیٹے کسی بلند و بالا پہاڑ کی تین چوٹیاں معلوم ہونے لگتے جو جانباز سنتری کے انداز میں کسی ملک کی سرحدوں پر کھڑی ہوں۔

خلیل خان کے سوچنے کا انداز اس آدمی سے بالکل ہی مختلف تھا جو نئی تہذیب کی زندگی کو اپنائے ہوئے ہے۔ اس کے نزدیک فوجی ہونا جرأت وانسانیت کی معراج پر پہنچ جانے کے مترادف تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ مستقبل کو اپنانے کے سلسلے میں جمہوری قدروں پر دل و جان سے ایمان رکھتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے ڈنڈے کے زور پر اپنی اولاد کو اپنی مرضی کے راستے پر چلانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے انہیں کھلی آزادی دے دی کہ زندگی گزارنے کے لئے وہ اپنی پسند کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ پسند اور ناپسند کا سوال ذات سے وابستہ ہے۔ کسی کو اپنی مرضی کا سکہ نہیں چلانا چاہیئے —— اور شاید اسی آزادی کا نتیجہ تھا کہ بڑے بیٹے نے وکالت کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کر کے پریکٹس شروع کر دی تھی اور دو سال کی مختصر مدت میں اس کا شمار اچھے وکیلوں میں ہونے لگا تھا

دوسرے لڑکے نے گریجویشن کے بعد بینک کے خشک میزانوں اور ضخیم رجسٹروں کو اپنی پسند کے عین مطابق پایا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بینک کی برانچ کا منیجر بن گیا۔ چھوٹے صاحبزادے صغر سنی ہی سے کتابی کیڑے تھے۔ علم کے بحرِ ذخّار میں غوطہ زنی ان کی زندگی کا نصب العین بن چکا تھا۔ افسانوی ادب کے غائرانہ مطالعہ نے ان کو بھی افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اور پھر مشاہدے کی وسعت اور باریک بینی نے بہت جلد انہیں مبتدی سے کہنہ مشق افسانہ نگار بنا دیا۔ اب وہ کثیر الاشاعت ادبی جریدے کے مدیر تھے۔ مگر خلیل خان اپنے بیٹوں کو تدریجی ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے دیکھ کر بھی مطمئن و آسودہ نہ تھا کیونکہ اس کا دل کسی اور شئے کا خواہاں تھا۔ وہ علم کی عظمت و سطوت کا قائل ضرور تھا مگر اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ بات بھی بیٹھ چکی تھی

کہ زندہ رہنے کے لئے انسان کو علم کا نہیں بلکہ میدان کا سپاہی ہونا چاہیئے۔ علم ایک خاص حد تک تو انسان کی رہنمائی کر سکتا ہے لیکن اس میں ڈوب جانے کے بعد آدمی بُزدلی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ تینوں بیٹے اپنے اختیار کردہ راستوں پر کامیابی سے چل رہے ہیں تو وہ خاموش ہوگیا۔

گھر کے در و دیوار پر ہمہ وقت سکون کے سائے رقصاں رہتے تھے۔ ماں باپ اپنی زوال پذیر طاقت اور کبرسنی کے باوجود اولاد کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی معمولی سی معمولی ضرورت کو پورا کرنا، ذرا ذرا سی تکلیف کو دور کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے تھے اور پھر اولاد بھی اتنی سعادت مند اور فرمانبردار تھی کہ ماں باپ کی ہر بات پر آمنّا وصدّقنا کہنا نماز کی طرح ایمان کا ایک جزو سمجھتی تھی۔ ان کے نزدیک ماں باپ کی حیثیت ایک مقدّس معبد کی سی تھی جس کا احترام سب پر واجب تھا۔ تینوں والدین کی عقیدت میں اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں رات کو دن، دن کو رات کہنے میں انہیں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی۔ ان کی سعادت مندی کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا تھا کہ یہ خبر سنتے ہی کہ باپ کو ٹائیفائڈ ہو گیا ہے، تینوں بیٹے اپنا کام کاج چھوڑ کر اس چھوٹے سے گاؤں کی طرف دوڑ پڑے اور سچ تو یہ ہے کہ ان ہی کی مخلصانہ تیمارداری اور دل سوزی کی وجہ سے خلیل خان تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔

خلیل خان کبھی کبھار اپنے فرحت افزا ماضی کی یاد تازہ کرنے کے لئے یوں آہستگی اور حفاظت سے غلاف سے بندوق نکالتا جیسے وہ کوئی نازک آبگینہ ہو۔ اور بے احتیاطی کی ٹھیس سے ٹوٹ جائے گا۔ پھر پیار و محبت کی نگاہوں سے اس کو دیکھتے ہوئے اس کی صفائی میں مصروف ہو جاتا۔ بیوی اس کی اس حرکت پر خوش مزاجی سے ٹوکتی تو وہ مسکرا کر کہتا۔

"شیروں کی ماں، یہ مرد کا زیور ہے۔ ہمارے اسلاف کی عظمت و برگزیدگی کا راز اس میں مضمر ہے۔" یوں اس خاندان کے شب و روز گزر رہے تھے۔

اور پھر ایک روز، بے حد ڈراؤنی کسی مجرم کے ضمیر کی مانند سیاہ رات کو اچانک خلیل خان

کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسرافیل کے صور پھونکنے کے بعد زمین کا دل قیامت کے جھٹکوں اور دھماکوں سے دہل اٹھا ہو۔ آوازوں کے طوفان سے درودیوار اس مریض کے اعصاب کی مانند لرز رہے تھے جس پر ناگہانی صدمے نے دھاوا بول دیا ہو۔ پہلے تو اسے یہ ایک بھیانک خواب معلوم ہوا۔ مگر جب اس نے گھر کے دیگر افراد کی آوازیں سنیں۔ ان کے چہرے دیکھے تو سوچنے لگا کہ خواب میں حقیقتیں اس انداز سے تو پیش نہیں ہوتیں۔ یہ تو حقیقت کا ایک سہما دینے والا روپ ہے! مگر وہ مرد میدان تھا۔ اس نوع کے لاتعداد واقعات اس کی نگاہوں سے گزر چکے تھے۔ اس لئے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز نہ ہو سکیں۔ ہاں نظروں سے ٹکرانے والی حیرت کو وہ دور نہ کر سکا۔ اور اس وقت تو حیرت کو مہمیز لگ گئی جب اس نے اپنے تینوں بیٹوں کو بندوق ہاتھ میں لئے اپنے سامنے کھڑے دیکھا۔

"ابا جی" اس کے تیسرے بیٹے نے ولولہ انگیز آواز میں کہا۔ "آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ آج ہم ثابت کر دیں گے کہ علم کی روشنی کو بزدلی کے اندھیرے نگل نہیں سکتے۔ نامساعد حالات میں علم صیقل شدہ تلوار بن کر دشمن کے رگ جاں پر مہلک ضرب لگا سکتا ہے۔"

"مگر ہوا کیا؟" خلیل خان نے بیتابی سے سوال کیا۔

"ابا جی! بزدل دشمن نے چوروں کی طرح رات کی تاریکی میں ہم پر حملہ کر دیا ہے۔"

بیٹے کے جواب سے وہ مطمئن نہ ہوا۔ اس نے اپنا شک دور کرنے کے لئے دوسری بار سوال کیا۔

"کیا واقعی دشمن نے حملہ کر دیا ہے؟" اس کا ذہن نیند کے اثرات سے آزاد ہو گیا تھا۔ وقت کی نزاکت کو وہ بھانپ گیا تھا۔

"جی ہاں ابا جی" دوسرے بیٹے کی پیشانی اندھیرے میں پہاڑ کی اس چوٹی کی مانند چمک رہی تھی جس پر شفق کی دلآویز سرخیوں نے سونا پگھلا دیا ہو۔ "آپ کی خواہش تھی کہ ہم آپ کے راستہ پر جانبازی کے جوہر دکھاتے ہوئے چلیں۔ دیکھئے وقت آنے پر ہم نے آپ کی مقدس آرزو کو اپنے سینوں سے لگا لیا ہے۔ ہمیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" وفورِ جذبات سے خلیل خان کی آواز بھرّا گئی۔ "ایک مقدّس راستہ تمہارا انتظار دیکھ رہا ہے۔ مگر یاد رکھو یہ راستہ صرف انہیں کے لئے ہے جن کے قدموں کو آگے بڑھنے کی تمنا ہوتی ہے پیچھے ہٹنے کی نہیں۔"

اس نے باری باری سب کی پیشانی چوم کر محبت کی حرارت انگیز مہر ثبت کردی۔ ایک کونے میں اس کی بیوی چپ چاپ کسی سحر زدہ کی مانند کھڑی زندگی کے اسٹیج پر کھیلا جانے والا یہ ڈرامہ یوں دیکھ رہی تھی جیسے خواب کی دنیا کی پرچھائیاں اس کی نگاہوں کے سامنے رقصاں ہوں۔ مگر اس کے انداز میں غم کا شائبہ تک نہ تھا۔ جب تینوں قدم بوسی کے بعد ماں باپ سے رخصت ہوئے تو یہ پتھر کا ستون ہولے سے لرزا مگر فوراً بادِ مخالف سے مقابلہ کرنے کے لئے مضبوطی سے اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اسی لمحہ اس کی بیوی نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ وقت آنے پر وہ تینوں فوجی بن جائیں گے۔" وہ جذباتی لہجہ میں بولی۔ "تینوں شیر ہیں شیر!"

"ہاں! اور تم شیروں کی ماں ہو۔" خلیل خان کی آواز کہیں دور سے ابھری اور دھماکوں کی آغوش میں پہنچ گئی۔ آوازوں کا طوفان بڑھ گیا تھا۔ زمین سے آسمان تک دھواں ہی دھواں تھا۔ جوان مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے سروں سے کفن باندھ کر گھروں سے نکل آئے تھے۔ گھر گھر شور تھا۔ بچے خوف سے چلا رہے تھے۔ البیلی حسینائیں چھیل چھبیلے رانجھوں کو ایک نئے عزم کے ساتھ رخصت کر رہی تھیں۔ ایک قیامت تھی جو سب کے سروں پر ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ مگر جس کی موجودگی میں بھی حوصلے ایک نئی صبح کے متلاشی تھے۔ رات کی سیاہی کافور ہو چکی تھی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مگر سب تو اس صبح کی راہ دیکھ رہے تھے۔ جس کے جانفزا اجالوں میں مادرِ وطن کے لبوں پر حیات افروز مسکراہٹ جھوم اٹھتی اور ہر روح بالیدگی و آسودگی کے زیور سے سج کر دلہن بن جاتی۔

شور بڑھتا گیا اور سورج نے چلتے چلتے نصف آسمان طے کر لیا اور ٹھیک دوپہر میں ایک آدمی بگٹٹ دوڑتا ہوا خلیل خان کے گھر پہنچ گیا۔

"خلیل خان! ہمارے بہادر جوانوں نے دشمن کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔" وہ تیز سانسوں

قابو پاتے ہوئے بولا "مگر تمہارا ایک بیٹا مارا گیا ہے"۔

"الحمد للہ" خلیل خان نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"مگر گولی اس کی پشت پر لگی ہے" لہجہ کیا تھا بندوق کی گولی تھی جو خلیل خان کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

"تب وہ میرا لڑکا نہیں ہو سکتا" کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر اس کی آنکھوں نے اندھیرے کے سمندر میں کئی ڈبکیاں کھائیں۔ دِل ڈوبنے لگا۔ اس نے بمشکل تمام اپنی حالت پر قابو پایا۔ جب محلّے کا آدمی چلا گیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا سینہ طوفان کا گھر بن چکا ہے۔ کشمکش نے اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال بن دیا تھا۔ کمرے میں اس کی بیوی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھ رہی تھی۔ حالت دگرگوں ہونے لگی تو اس نے بھی جانماز بچھائی اور بندۂ ناچیز کی حیثیت سے خدا کے ایمان افروز دربار میں داخل ہو گیا۔ تاریک احساسات پر ایک مقدس دھوپ کی چادر پھیلی تو روح شبنم سے دُھلے پھولوں کی طرح پاکیزہ و منزّہ ہو گئی۔

آج نہ جانے کیوں سورج کی زرد روشنی میں ایک عجیب سی سُرخی گھلی ہوئی تھی جیسے زمین کا لہو آسمان پر پھیل گیا ہو۔ گاؤں میں ہلکا ہلکا شور تھا۔ عورتیں بُری طرح گھبرائی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ٹرک آ گئے اور ٹرکوں سے شہیدوں کی لاشیں اتاری جانے لگیں جس کی وجہ سے فضاؤں کی سوگواری ہزار چند ہو گئی۔ بعض گھروں کی چھتیں آہوں اور سسکیوں سے ہل رہی تھیں۔ مگر خلیل خان کا گھر کسی مردہ کی طرح بے آواز تھا۔ وہ اور اس کی بیوی یوں راضی بہ رضا تھے جیسے قدرت کے فیصلے کے سامنے انہوں نے اپنے سر جھکا دیئے ہوں۔ اس کی بیوی تو صمٌ بکمٌ تھی۔ ایک پتھر کی طرح بے حس معلوم ہو رہی تھی مگر وہ کچھ بے چین بے چین سا تھا۔ اِدھر اُدھر ٹہلتا جا رہا تھا اور کچھ سوچتا جا رہا تھا۔ اور پھر ایک بار ٹہلتا ہوا دروازے کے پاس آیا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ کھُلے دروازے کے باہر اس کی نگاہیں پھسلتی ہوئی دور تک چلی گئیں۔ اس نے دیکھا کہ محلّے والے چادروں سے ڈھکی تین لاشیں اٹھائے غم و اندوہ کی تصویر بنے اس کے گھر کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے پائے استقامت میں لغزش سی آ گئی مگر دوسرا لمحہ جوش اور ولولے کا پیغام بن کر

اس کے دل میں در آیا۔ اس نے بڑے تحمل سے تینوں لاشوں پر نظر ڈالی اور سر کو جھکا لیا۔

"ہمارے جانبازوں نے دشمن کو پسپا کر دیا ہے خلیل چچا!" ایک نوجوان نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں سمجھ گیا ہوں۔" اس کی آواز میں تلوار کی سی تیزی تھی۔ "اس میں بھی مصلحت ایزدی ہے۔ جاؤ تینوں لاشیں چارپائیوں پر بیٹھک میں رکھ دو۔ میں خوش نصیب ہوں۔ جس گھر میں تین بہوؤں کے ڈولے آنے چاہیئے تھے۔ ان کے بجائے اس گھر میں جنّت کے تین پھول آگئے ہیں۔ میں خوش نصیب۔۔۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا مکان کے اندر چلا گیا۔

"شیروں کی ماں" اس نے اپنی بیوی کو زور سے جھنجھوڑ دیا جو ہنوز جانماز پر بیٹھی عبادات و مناجات کے لامتناہی سلسلے میں گم تھی۔ "خوشخبری سنو۔ خدا نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے۔ تم خوش نصیب ہو تمہارے تینوں شیروں کو شہادت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں۔ ہم۔۔۔۔ ہم۔۔۔"

اور تب اس کی بیوی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرے پر تقدس پھیلا ہوا تھا۔

"مگر شیروں کی ماں۔" اس کا لہجہ کربناک تھا۔ "تم نے سنا ابھی فضلو کیا کہہ گیا ہے۔"

"کیا؟" اس کی سوالیہ نظریں بے چین تھیں۔

"تمہارے ایک شیر نے پشت پر گولی کھائی ہے۔"

"غلط! ناممکن!" آواز کیا تھی جیسے زخمی شیرنی دہاڑ پڑی ہو۔ "میں نے شیروں کو جنم دیا ہے کسی گیدڑ کو نہیں، فضلو غلط فہمی کا شکار ہوا ہے۔ میرا کوئی شیر میدانِ جنگ میں پیٹھ نہیں دکھا سکتا۔"

"تو چل کر خود دیکھ لو۔ تمہیں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔" خلیل خان اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس کی آواز ناقابلِ شکست عزم سے بھرپور تھی۔ دونوں قدم ملاتے ہوئے بیٹھک میں آگئے۔ سامنے لاشیں چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

"اگر فضلو کی بات درست ثابت ہوئی تو میں اس لڑکے کا دودھ نہ بخشوں گی اور نہ کبھی اسے معاف کروں گی۔"

شیرنی گرجی۔

"اب تم چادر الٹ کر دیکھو۔" اس نے خلیل خان کو حکم دیا۔

"نہیں یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔" خلیل خان نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر میری نگاہوں نے کسی شیر کی پشت پر گولی دیکھ لی تو یہ شرمناک منظر میرے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوگا۔ تم خود دیکھو۔"

شوہر کی یہ بات سن کر وہ باوقار انداز میں آگے بڑھی اور ایک لاش پر سے چادر الٹ دی۔ اچانک اس کا چہرہ شبنم سے دھلے نوخیز پھول کی طرح کھل اٹھا۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ دوسری لاش کی چادر الٹنے کے بعد بھی وہ انہیں جذبات سے ہمکنار ہوگئی۔ مگر تیسری لاش کے پاس پہنچ کر اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار ہویدا ہوگئے۔ ذہن منفی خیالات کی آماجگاہ بن گیا جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ اگر اس کا دعویٰ غلط ثابت ہوا تو وہ کیسے اپنے شوہر سے نظریں چار کر سکے گی؟

"خدایا! میری لاج رکھ۔" ـــــ وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا جیسے زندگی کی ساری دھڑکنیں وہ آج ہی مکمل کر لے گا۔ پھر اس نے اللہ کا نام لے کر چادر کو الٹ دیا ـــــ اور جیسے دوسرا لمحہ اس کے لئے خوشیوں کا طوفان لے آیا۔ چہرے پر سرخ رنگ پھیل گیا۔ آنکھیں فخر و انبساط سے اصلی ہیروں کی طرح چمک اٹھیں۔

"دیکھا! میں نے کہا تھا نا کہ میں شیروں کی ماں ہوں۔ میں نے شیروں کو جنم دیا ہے۔" اس کی آواز مسرت کے سبب کانپ رہی تھی۔ "میرے تینوں شیروں نے سینے پر گولی کھائی ہے۔"

یہ سنتے ہی خلیل خان دیوانہ وار اپنے شیروں کی لاشوں کی طرف بڑھا اور بڑی محبت سے اپنے تینوں بیٹوں کی پیشانی چوم لی۔ پھر عقیدت سے اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کر آہستہ سے دبایا اور ندامت بھرے لہجے میں بولا۔

"شیروں کی ماں! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا گناہگار ہوں۔"

"معافی! کیسی معافی؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"جب پہلی بار مجھے یہ خبر ملی تھی کہ تمہارے ایک شیر نے پشت پر گولی کھائی ہے تو میں تمہارے متعلق مشکوک ہوگیا تھا۔ مجھے تمہاری وفاداری پر شبہ ہوگیا تھا۔"

جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو ـــــ وہ تڑپ کر رہ گئی اور چند لمحات کے سکوت کے بعد اس نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔ "اور اب؟"

"اب تو تمہاری عصمت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔" وہ بولا۔ "تم حقیقت میں شیروں کی ماں ہو ـــــ اور مجھے ـــــ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں تمہارا شوہر ہوں ـــــ"

اور شیروں کی ماں عجیب فخریہ انداز میں ٹکٹکی باندھ کر اپنے تینوں شیروں کو دیکھ رہی تھی جو اس اطمینان سے سو رہے تھے جیسے کہ شیر شکار کے بعد آرام کرتا ہے!!
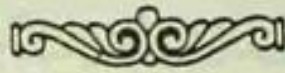
ممّی کا غم

اور پھر جیسے اچانک رنگ بھری شام کے دل سے دھواں اُٹھنے لگا ہو۔ چاند کی طرح چمکتے ہوئے رومانی احساسات شکست و ریخت کی آغوش میں پہنچ گئے ہوں۔ حُسینہ نے اپنی ممّی کی بات سن کر کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔

"ممّی!" اُس نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا مگر سینے میں کرچی سی چبھی تو ٹھہر یہ لب ہو کر رہ گئی مگر بڑھتا ہوا غصہ نہ رُک سکا۔

"ڈارلنگ! چلی جاؤ نا اپنی آنٹی کے پاس!" اُس کی ممّی نے اپنے سُرخ سُرخ لپ اسٹک زدہ ہونٹوں پر ایک انگلی پھیرتے ہوئے دلرُبانہ شان سے کہا۔

"مگر میرے وہاں جانے سے فائدہ؟" وہ جِز بز ہو کر بولی۔

"انہوں نے تمہیں بُلایا تھا ڈیئر!" اس بار مسکرانے کی کوشش کی گئی مگر سُرخیوں کے بوجھ تلے دبی مُسکراہٹ اُبھر نہ سکی۔ "اور پھر اِن کی بیماری کا تو خیال کرو۔ بیمار کی بات ٹالنا گناہِ کبیرہ ہے۔ کیوں فرحت؟" انھوں نے مُڑ کر فرحت کی طرف دیکھا جو ایک صوفے پر سر جھکائے بیٹھا بے دال کا بُودم معلوم ہو رہا تھا۔ غصہ تو اُسے بھی آرہا تھا مگر جانتا تھا کہ اس کا اظہار ممکن نہیں۔ کون سنتا ہے فغانِ درویش؟ قہرِ درویش برجانِ درویش کے مصداق وہ خاموش تھا۔ ممّی نے اُس کا نام لیا تو وہ چونکا مگر جملہ تو اُس نے پورا سنا ہی نہ تھا پھر بھی بے مقصد میکانکی انداز میں سر کو ہلا دیا۔

حُسینہ نے فرحت کو سر ہلاتے دیکھا تو اُسے تاؤ آگیا۔ کم از کم ایسے موقع پر تو فرحت کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے تھا۔ محبت کا تقاضہ تھا مگر یہاں اعلیٰ حضرت بھی ممّی کی باتوں کے جنگل میں پھنس گئے تھے۔ "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے" والی بات تھی۔ اُس کا غصہ

نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ اب وہاں مزید ٹھہرنا اُس کے لئے دُوبھر ہو گیا۔ بھنّا کر اٹھی اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ آج پہلی بار ممّی سے متعلق باغیانہ خیالات اِس طوفانی شدّ ومدّ سے اُس کے ذہن میں اُبھرے تھے۔ اِن خیالوں کی آغوش میں زہریلے لاوے کی تپش سانپ کی طرح لہرا رہی تھی۔ اور پھر جب اِس تپش نے جھوم کر سینے پر یلغار کی تو اس کے دل کی حالت تنور میں دبی روٹی کے مماثل ہو گئی۔

وہ بپھرے ہوئے طوفان کے نقوش چہرے پر سمیٹے بڑ گولا کی فرحت آگیں چھاؤں کا سینہ کچلتی ہوئی پورٹیکو کی طرف بڑھ گئی جہاں بیر بہوٹی کے رنگ کی اِمپالا سطوت وعظمت کے احساس اور شانِ تکبّر کو اپنائے اُس کے انتظار کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئی تھی۔ نوجوان قوی ہیکل ڈرائیور نے جب اُس کو محشر بداماں، آفتِ بے درماں کے انداز میں آتے دیکھا تو کار کی صفائی کا کام چھوڑ کر پچھلا دروازہ کھولنے آگے بڑھ گیا۔

اور پھر چند لمحوں بعد جب کار شاہی انداز سے گیٹ سے نکلی تو حسینہ نے رعونت سے گردن کو ہلکے سے موڑ کر اپنی جدید طرز کی کوٹھی کو دیکھا اور پھر فوراً ہی تنفّر آمیز انداز میں اپنی گردن پھیر لی۔ عمارت جتنی دلنشین، جتنی خوبصورت تھی اُس کا ماحول اُتنا ہی زہریلا اور قابلِ نفریں تھا۔ یہاں کی بس بھری فضاؤں میں اُس نے بارہا اپنی لطیف و نازک حسّیات کو مجروح ہوتے دیکھا تھا۔ یہاں کی نیندیں ڈراؤنے خوابوں کا پیش خیمہ ہوتی تھیں اور اُس کی زندگی ایک ایسی رُوح کا سفر بن گئی تھی جو نفسِ مطمئنہ کی تلاش میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھا رہی ہو!

کار کی رفتار تیز ہوئی تو ٹھنڈی ہوا کے کچھ جھونکے اُس کے چہرے پر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے گزر گئے۔ اُس کے خیالات کی آگ کچھ اور بھڑک اُٹھی۔ شاہراہ پر مٹر گشت کرنے والے راہگیر جیسے اس کا منہ چڑانے لگے ہوں۔ وہ جھنجھلا گئی۔ جیسے اس کی ممّی نے اُس کے ستانے کے لئے کرائے کے آدمی بھیج دیئے ہوں۔ ممّی کا خیال آتے ہی اس کے غصّہ کو مہمیز لگ گئی۔ اُس کی ممّی پتہ نہیں کیا شئے تھی؟ اُس نے تو اُس کی جان ضیق میں کر رکھی تھی۔ بچپن سے وہ اُسے دیکھتی آئی تھی مگر آج تک اُسے سمجھ ہی نہ سکی تھی۔ اس کی شخصیت کی اُلجھی ہوئی گتھیوں نے اُس کی ذہنی صلاحیتوں پر گرہیں لگا دی تھیں۔ اس کے

حواس مختل کر دیئے تھے!!

اِن سب باتوں کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اُس کے باب میں اُس کی ممّی ایک جابر ماں کا کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ تو بے حد منکسر المزاج اور رحمدل تھی۔ اس کی شریعت میں انسان تو خیر دُور کی بات ـــــ ایک سڑے ہوئے کتے کو مارنا بھی جائز نہ تھا۔ طبیعت مکھن سے زیادہ ملائم تھی کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ دُکھیوں کی پہلی آواز پر لبّیک کہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مظلوم و مستحق عورتوں کو فرعون صفت مَردوں کی دستبرد سے بچانے کا مصمم عہد کر کے وہ ایک عرصے پہلے میدانِ عمل میں اُتری تھی اور امتدادِ وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ہمّتِ رندانہ سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مشن کو کامیابی سے چلا رہی تھی۔ اب وہ نیشنل ویمن ایسوسی ایشن کی جنرل سیکریٹری تھی۔ اس کے کارہائے نمایاں نے اُس کو سوسائٹی کا روحِ رواں بنا دیا تھا۔ وقت کے بے درد ہاتھوں ستائی ہوئی عورتوں کے نزدیک اس کی ذات نجات کی پُر کیف علامت بن چکی تھی۔ پھر ایسی عظیم المرتبت ہستی کیونکر اپنی لاڈلی، اکلوتی بیٹی سے سوتیلا سلوک برت سکتی تھی؟ اُس کی محبت تو اسی بات سے واضح تھی کہ شوہر کی ناگہانی موت کے بعد صرف حسینہ کے خیال سے اُس نے دوسری شادی نہ کی تھی، حالانکہ اُن دنوں اُس کی جوانی شراب کے نشہ آفریں جام کو شرماتی تھی۔ وہ تو اپنی بیٹی کو اپنی آنکھوں کی بصارت سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ اس کی ہلکی سی تکلیف، معمولی سی پریشانی اُس کو دل گرفتہ کر دیتی تھی مگر اس کے باوجود حسینہ اُس کو اپنی جان کا دشمن متصور کرتی تھی۔ نہ جانے کتنی شکایات اُس کی ذات سے وابستہ تھیں اور اس کے لئے شاید حسینہ حق بجانب بھی تھی کیونکہ غیر دانستہ طور پر اُس کی ممّی نے اُس کے نازک دل کو بارہا ٹھیس پہنچائی تھی۔ ایک بار اُس کے ایک بوائے فرینڈ نے بجا طور پر کہا تھا۔

"مانا تمہاری ممّی مجبور عورتوں کو اُن کے حقوق دلاتی ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی وہ دوسری عورت کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں۔ ہے نا چراغ تلے اندھیرا والی بات؟" اس کا لہجہ تلخ تھا۔ وہ چونک پڑی تھی۔

"کیا مطلب؟" اُس نے پوچھا تھا۔

"انجان بننے سے فائدہ؟" اُس نے اپنے لہجے کا اعادہ کیا تھا۔ "کیا یہ سچ نہیں کہ تمہاری ممّی

تمہارے جائز حقوق کو اپنی ہوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رہی ہیں؟" اور تب حسینہ کوشش کے باوجود ثابت نہ کر سکی تھی کہ اُس کی بات کذب و افترا کی پوٹ ہے۔ پھر اُس کے بعد اُس غیرت مند بوائے فرینڈ نے اُس کے گھر کے چکر کاٹنے سے احتراز کیا تھا اور اُس کی ممی کی مصالحانہ کاوشوں کے باوجود اُس کے گھر کی چوکھٹ پر دوبارہ اپنا قدم نہیں رکھا تھا۔ اور یہ پہلا حادثہ نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی حالات کی کوکھ نے اِسی نوع کے کئی حادثوں کو جنم دیا تھا جو اُس کے ذہن پر وقتی تاسف کے نقش مرتسم کر کے معدوم ہو گئے تھے۔

خدا معلوم اُس کی ممی کو کون سی بیماری لاحق تھی کہ وہ اُس کے دوستوں کو بھی اپنا دوست سمجھتی تھی اور کبھی کبھی تو ایسا ہوا تھا کہ اُس کے دوست چند سرسری ملاقاتوں اور رسمی میل ملاپ کے بعد اُس سے ناطہ توڑ کر صرف ممی کے دوست بن کر رہ گئے تھے۔ اگرچہ یہ باتیں اُس کے نزدیک ناپسندیدہ تھیں مگر اس کے باوجود اُس نے خندہ روئی اور خندہ پیشانی سے ممی کی ان غیر اخلاقی حرکتوں کو قبول کر لیا تھا اور پھر اُس کا حلقۂ احباب کچھ ایسا کم وسیع نہ تھا کہ ایک کے چلے جانے کا غم اُس کو مدتوں بے چین رکھتا۔ مگر فرحت کے باب میں اُس کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ اُس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلک اٹھا۔ فرحت ——— وہ تو اُس کے دل کی دھڑکنوں پر چھیڑا ہوا ایک مدھر گیت تھا۔ مَن سنگیت تھا۔ یہ بات سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے کہ عورت کا وجود جاوداں قربانیوں کے خمیر سے اٹھا ہے۔ مگر ہر عورت کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ اپنی دل پسند شئے کے حصول میں خود غرض بن جاتی ہے اور آج وہ خود غرضانہ احساسات کی چوکھٹ پر قدم رکھے اپنی ممی کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جو صرف رقیبوں کے لئے مختص ہوتی ہیں۔

دوسرے دن جب اُس نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تو دبیز اُداسی، گہرے غم اور بے حساب غصے کے امتزاج نے اُس کو ایک ایسی ہیزانی کیفیت سے قریب کر دیا تھا جس کا کوئی نام نہیں تھا مگر جس کے اُبھرتے ہی اُس کے دل میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ ایک دو بار تو وہ یوں اپنی نگاہوں میں اجنبی بن گئی جیسے اُس کے دل نے کسی دوسرے کے دل کی دھڑکنیں مستعار لے لی ہوں۔ کوریڈور پر طلباء و طالبات اِدھر اُدھر سرگشت کر رہے تھے۔ ٹولیوں میں کھڑے بحث و تمحیص کی نئی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے سب کی اُنگلیاں اُس کی سمت

اُٹھ رہی ہوں۔ جیسے وہ ایک بہت خطرناک عامیانہ مذاق کا ہدف بن گئی ہو۔ غصہ شرم سے بغلگیر ہوا تو وہ کٹ کر رہ گئی۔ ایک بار پھر ممی سے متعلق ناگوار تصوّر اُس کا ہمزاد بن گیا اور اس وقت اس کا غصہ ساتویں آسمان سے باتیں کرنے لگا جب اس کی نگاہوں نے کلاس کے نزدیک نوابوں کے انداز میں استادہ فرحت کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ وہ قریب آیا تو اُس نے بیزاری سے اپنا مُنہ پھیر لیا۔

"لو یہ تو وہی بات ہوئی۔ میں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا" فرحت کا لہجہ شوخ رنگوں میں ڈوبا ہوا تھا" ایک تو سرکار نے خاکسار کو دولت خانہ پر بُلایا اور پھر میزبانی کے فرائض بھول کر وہاں سے چلتے بنے"۔

"کیا کہا!! کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔ اُس کا جسم غصہ سے لرزنے لگا۔

"نہیں ہوا تو اب ہو جائے گا" وہ بے نیازی سے بولا۔

"تمہارا مطلب ہے میں اپنی مرضی سے گئی تھی" وہ دیدے گھما کر بولی" اگر تم ممی کی ہاں میں ہاں نہ ملاتے تو اس کی کب نوبت آتی !!"

"تمہاری ممی !!" فرحت کے چہرے پر عظیم المرتبت فلسفیوں کی متانت اُبھر آئی" تمہاری ممی کی آمریت نازیوں کے طرزِ عمل سے زیادہ خطرناک ہے۔ بے شک بادی النظر میں وہ ضرر رساں نہیں مگر ___ مگر شاید اُنہوں نے اپنی زندگی کے باطنی منشور کی بنیاد جباری و قہاری پر رکھی ہے۔ اُن کی روح نطشے کے فوق البشر کی طرح رحم سے یکسر عاری ہے"۔

"اب اپنی علمیت کا رعب مت جماؤ" اُس نے بُرا سا منہ بنا کر فرحت کو دیکھا۔ وہ خود ممی کی حرکتوں سے عاجز تھی مگر اس کے باوجود وہ فرحت کے لبوں سے نکلی ہوئی ممی کے خلاف تلخ بات کو برداشت نہ کر سکی۔

"یہ علمیت نہیں حقیقت کا اظہار ہے حسینہ !!" فرحت کی دبیز سنجیدگی میں رتی برابر فرق نہ آیا" میں کہتا ہوں کہ ___" اور عین اُسی لمحے یونیورسٹی کی رنگ بھری فضاؤں میں الیکٹرک بیل کی تیز آواز گونجی اور فرحت کی بات کا گلا گھُٹ کر رہ گیا۔ پیریڈ شروع ہو چکا تھا طلباء و طالبات کلاسوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

لیکچر کے دوران اُس کا دھیان کسی اور طرف تھا۔ فرحت کی بات نے اس کے دل میں

خطرے کی گھنٹیاں بجادی تھیں۔ ممی سے متعلق فرحت اور اُس غیرت مند ہوائے فرینڈ کے خیالات میں کتنی قریبی مماثلت تھی جو اپنی اور حسینہ کی دوستی کے درمیان اُس کی ممی کے وجود کو برداشت نہ کر سکا تھا۔ تب اُس نے سوچا کہ کیا فرحت بھی اُس کو تنہائی کے ریگزاروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ جائے گا؟ اِس خیال کی اذیت ناکی نے اُس کو لرزہ براندام کر دیا۔

فرحت کی قربتیں اُس کی محبت کا جُزوِ لاینفک بن چکی تھیں۔ اُس کے بغیر اُس کی زندگی ایسی تھی جیسے رُوح کی لطف انگیز حرارت سے خالی ایک بے جان جسم!! اس سے پہلے دوسروں کی دوستی اُس کے لئے طفلِ نوخیز کے ہاتھوں میں کھلونے کے مماثل تھی۔ بس جی بہلانے کے لئے جی بھر کر کھیلا اور اُکتاہٹ کے احساس کے ساتھ ہی زمین پر ٹپک دیا۔ مگر فرحت۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے وہ اس نوع کے بے شمار کھلونوں کو ٹھکرا سکتی تھی۔ تصوّر میں تو اُس نے فرحت کو اپنا جیون ساتھی بنالیا تھا اور اب اپنے اس رنگ بھرے تصوّر کو عملی شکل دینے کے لئے وہ ممّی تو کیا ساری دنیا سے ٹکر لے سکتی ہیں!!

پیریڈ ختم ہونے کے بعد دونوں پھر ملے۔

"میرے جانے کے بعد ممّی تمہیں کہاں لے گئیں؟" حسینہ کا لہجہ تشکیک کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کیفے ڈی لکس" فرحت کی آواز بے جان تھی۔

"اور تم چلے گئے؟" وہ شکایتی آواز میں بولی۔

"میں تو کیا کوئی بھی ہوتا تو اُس کو جانا پڑتا۔" وہ بولا "ان کے آمرانہ حکم کے آگے بھلا کس کی چل سکتی ہے۔"

"آج کا کیا پروگرام ہے؟"

"آج انہوں نے پھر شام کو مدعو کیا ہے۔"

"اور تم یقیناً جاؤ گے۔" اُس نے ہلکے طنز سے کہا۔

"نہیں! بے فکر رہو۔" فرحت کے لبوں پر مسکراہٹ کی کلی کھلی۔

"دل سے کہہ رہے ہو؟"

"اِس وقت تو زبان سے کہہ رہا ہوں۔"

"مَیں تمہاری حرکتوں سے خوب واقف ہوں۔" وہ جل گئی۔" جاؤ۔ سو مرتبہ جاؤ۔ میری بلا سے۔"

"اماں یار! خفا کیوں ہوتی ہو۔ نہیں جائیں گے۔" اُس کا لہجہ مذاق اور سنجیدگی کا مرکب تھا" اور کبھی نہیں جائیں گے۔ یہ میرا طے شدہ وعدہ ہے۔"

"شکر ہے خدا نے تمہیں نیک توفیق دی۔"

"نیک توفیق تو بہت پہلے مل چکی تھی مگر تمہارا خیال پیشِ نظر تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہاری ممی سے میل ملاپ کا میں کبھی خواہشمند نہ تھا، مگر سوچتا تھا کہ میرے انکار سے تم ناراض نہ ہو جاؤ۔" فرحت نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔" مگر اب جب کہ تم خود ہی میری ہم خیال ہو تو اُن سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا پھر ہچکچا کر بولا۔" مگر حسینہ ایک بات ضرور کہوں گا۔ تمہاری ممی جو کچھ کر رہی ہیں وہ کچھ ٹھیک نہیں!"

"میں خود بیزار ہوں" اس نے بیزاری سے کہا۔" مگر کیا کروں۔ ان کی اِس بیماری کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔"

"خدا اُنہیں بھی نیک توفیق دے۔" فرحت منہ ہی منہ میں بدبدایا۔

اُس شام حسینہ نے اپنی ممی کو دیکھا تو ورطۂ حیرت میں ڈوب کر رہ گئی۔ وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی اپنی عمرِ رفتہ کے قیامت خیز لمحات کو آواز دے رہی تھی۔ میک اپ کے مصنوعی ذرائع سے وہ اپنی ادھیڑ جوانی کو اُن الف لیلوی شہزادیوں کے ہوش رُبا، سحر آفریں حُسن کا جواب بنانے کی کوشش کر رہی تھی جن کا شربتِ دیدار پی کر الف لیلوی شہزادے مدہوشی اور بے ہوشی کے درمیان آٹھوں پہر بھٹکتے رہتے تھے۔ خضاب کی چمکدار سیاہی میں غسل کر کے بالوں کی اُوپری سطح پر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے چاندی کے تار تو معدوم ہو گئے تھے۔ جدید فیشن کے چُست لباس میں ڈھلکے ہوئے جسم کے خطوط اور دائرے تو نمایاں ہو گئے تھے مگر پاؤڈر کی متعدد تہیں بھی چہرے کی گری ہوئی جھریاں دُور نہ کر سکیں تھیں۔ جوانی کا کھنڈر جوانی کا تاج محل نہ بن

سکا تھا۔ اور تب حسینہ نے سوچا کیا بڑھاپے کی سرد راکھ میں دبی سرد چنگاری بھڑک کر جوانی کا شعلۂ مستعجل بن سکتی ہے؟ وہ بھلا کس طرح اپنی ممی کو یہ بات سمجھا سکتی تھی کہ پُرانی شراب کی تندی و تلخی ہزار چند ہوسکتی ہے مگر شباب پرانا ہو جائے تو جسم راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے! غصّہ اور نفرت کا حصار اس کے گرد اور مضبوط ہو گیا۔ اُس کا دل منفی احساسات کے پاتال میں ڈوب کر اُبھرا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی مگر آئینے نے ممی کے کانوں میں اُس کی کمرے میں موجودگی کا اعلان کردیا تھا۔ آئینہ جو ہمیشہ سچ بولتا ہے مگر اُس کی راست گوئی کے باوجود ممی اپنے متعلق خود فریبی میں مبتلا تھی!! وہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتے ہوئے حسینہ سے مخاطب ہوئی۔

"ڈارلنگ!" اُس کی آواز میں اُن لہروں کا ترنّم تھا جو چاندنی راتوں میں سمندر کے سینے پر بے اختیار ناچ اُٹھتی ہیں۔ "آج فرحت نہیں آیا؟"

حسینہ خاموش رہی۔ وافر غصّہ نے اُس کی قوّتِ گویائی سلب کرلی تھی پھر ممی نے خود ہی کہا "میں ایک اہم میٹنگ اٹینڈ کرنے جارہی ہوں۔ اگر فرحت آئے تو کہنا کہ آٹھ بجے مجھ سے ہائیک فنڑ جبیر الڈ میں ملے۔"

اس بار بھی حسینہ چُپ رہی۔ اُس کا غصّہ وہ سیاہ بادل بن گیا تھا جو کُھل کر برسنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ جب وہ تزئین و آرائش کا بوجھ لے کر باہر نکلی تو حسینہ نے محسوس کیا کہ نفرت کا وہ بیج جو اُس کے دل میں ممی کے کرتوتوں نے بویا تھا، اب پھیلتے پھیلتے ایک وسیع جنگل بن گیا ہے۔ اُس کے دل میں جیسے کوئی گرم انگشت سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک خوبصورت کوٹھی میں بے مقصد اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ پتہ نہیں کیوں بار بار اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کوٹھی عفریت گرسنہ بن کر اُس کو اپنی آغوش میں لے لے گی۔

پھر ملازم نے فرحت کی آمد کی اطلاع دی تو وہ چونک اُٹھی۔ خیالی دنیا کے مُبہم سائے حقائق کی تیز دھوپ میں اس مومی مجسّمہ کی طرح پگھل کر معدوم ہو گئے جس کو شعلوں نے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ ذہن کے راستے پر ہوش کا اُجالا پھیلا تو اُس نے سوچا کہ وہ چٹان۔ جو اُس کی اور فرحت کی محبت کی راہ میں کھڑی ہے، اس کو ہٹانا ازبس ضروری ہے۔ جب ممی کی مادرانہ شفقت نے اُس کی محبت کے ساتھ انصاف نہیں برتا تو وہ کیوں لحاظ کرے۔ آج

پہلی بار اُس کی سوچ یوں باغیانہ انداز میں اس سے ہمکلام ہوئی تھی!! پھر وہ فرحت سے ملنے ڈرائینگ روم کی طرف چل دی۔

"بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے" اُس کو دیکھ کر فرحت نے شوخی سے کہا۔

"یہ بات تو مجھے تم سے کہنا چاہیئے تھی" حسینہ اتنی دیر کی ذہنی کوفت کے بعد مسکرائی۔

"مجھ سے!! وہ کیوں ــ؟" فرحت کی شوخی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ وہ تعجب سے بولا۔

"اِس لئے کہ تمہارے شدید انتظار کے بعد ممی نے ابھی ابھی گھر چھوڑا ہے ــ کاش تم چند لمحے پہلے آجاتے!" حسینہ نے چڑانے کے لئے نیم طنزیہ، نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔ مگر فرحت یوں کھلکھلا کر ہنس دیا جیسے اِس مذاق نے اُس کے طبعِ سلیم کو بالیدگی بخش کر اُسے محظوظ و مسرور کر دیا ہو۔

"اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو واقعی مجھے دیر ہو گئی"۔

"اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ گہری متانت نے پیشانی پر دو متوازی لکیروں کو نمودار کر دیا۔ "اب میں اِس کھیل کو مزید برداشت نہیں کر سکتی"۔

"تو تمہیں کوئی حل تلاش کرنا ــــ؟" وہ پتلون کی کریز ہاتھ سے دُرست کرتے ہوئے بولا ــــ "تمہاری ممی ــــ"

"میری ممی تو تمہارے لئے ہوّا بن گئیں" وہ ناراضگی سے بولی۔ "اُن سے صاف صاف باتیں کرنے کے لئے کیا تمہارے پاس زبان نہیں؟"

"بھئی کیا کہوں۔ اپنا بزرگ سمجھ کر ہمیشہ خاموش رہا" فرحت نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر خیر ــ اِس بار تو میں کُھل کر بات کروں گا"۔

اس سے قبل کہ دوسرے لطیف موضوعات کا دفتر کُھل جاتا، کاریڈور کا سناٹا قدموں کی چاپ سے ہم آہنگ ہو کر ایک بے نام راگ کی تخلیق میں مصروف ہو گیا۔ پھر حسینہ نے دروازے میں اپنی ممی کو کھڑے دیکھا تو حیرت سے اُس کا منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔

"ممی ــــ آپ!! ــــ آپ میٹنگ میں نہیں گئیں؟"

"ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا" اُس نے اُن نظروں سے فرحت کو دیکھا جو شاید زلیخا

نے یُوسف کے لئے مختص کیا تھا۔ فرحت بے چارے نے عطوفت و محبت کی اس فراوانی کو دیکھا تو گڑبڑا کر رہ گیا۔

"فرحت!! اچھا ہوا تم آ گئے ـــــ آؤ آج میں تمہیں ایک خاص جگہ کی سیر کراؤں" ممّی نے لفظ "خاص" پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے یوں بے تکلفی سے کہا جیسے وہ اُس کے بچپن کا یارِ غار ہو۔

"مگر ـــــ وہ میٹنگ ـــــ" فرحت کا خون خشک ہو رہا تھا۔ اُس کی آواز میں لکنت آ گئی تھی۔

"اُوہ ـــــ وہ اہم ہے مگر اتنی اہم بھی نہیں" ـــــ ممّی کی اُونچی ہنسی نے ایک لمحہ کے لئے اُن کی چند جھرّیوں کو یوں معدوم کر دیا۔ جیسے گرم اِستری پھیرتے ہی کپڑے کی سلوٹیں دُور ہو جاتی ہیں ـــــ "آؤ ـــــ اُٹھو جلدی سے"

فرحت نے بیچارگی سے حسینہ کی طرف دیکھا۔

"جاؤ نا ـــــ ! تفریح ہو جائے گی" حسینہ نے ہلکے سے طنز سے کام لیا۔

ممّی محبوبانہ انداز میں فرحت کو ساتھ لے کر کمرے سے نکلی تو اُس کا سویا ہوا وحشی غصہ بپھرے ہوئے زخمی شیر کی دھاڑ بن کر جسم کے قید خانہ کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرانے لگا۔ جیسے چند لمحے پیشتر اُس کے سامنے ممّی کھڑی نہ تھی ایک آتشیں گھٹا تھی جو اُس پر آگ کی بارش اور انگاروں کے اولے برسا کر کہیں دُور چلی گئی ـــــ رات طوفانی ہیولیٰ بن کر فضاؤں پر چھا گئی تو منفی احساسات کی چاپ دل میں یوں شدّت سے اُبھری کہ اس کی آنکھیں جہنمی انگاروں کی تپش سے سُرخ ہو گئیں۔ بُھوک تو کبھی کی مر چکی تھی مگر پیاس لحظہ بہ لحظہ فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے مسہری پر رات گزرنے کے انتظار میں نہ جانے کتنی تکلیف دہ کروٹوں کا شمار کیا، مگر اچانک صحیح تعداد کا گوشوارہ بھول کر اُس کا ذہن بڑھتی ہوئی ذہنی اذیت کے خیال سے ہم آغوش ہو گیا۔ وہ سو گئی مگر کسے معلوم تھا کہ وہ نیند تھی کہ بے ہوشی!!

صبح جب اُس کی آنکھ کُھلی تو ممّی اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ وہ حیران سی رہ گئی کیونکہ ممّی کا سحر خیزی سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ پھر اُس نے بہ نظرِ غائر دیکھا تو آنکھوں کو پھیلنے سے نہ روک سکی۔ ممّی کے انداز سے اضطراب ہویدا تھا۔ ایک ہی رات میں اُس نے نہ جانے عمر کی کتنی اَن دیکھی

منزلیں طے کرلی تھیں۔ نہ جانے کتنے راستوں کے پیچ وخم کی اذیتوں کا زہر چکھ لیا تھا۔ چہرے کی جھریوں کی چنٹ میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اُن آنکھوں کی چمک ڈوب گئی تھی جو ہمہ وقت گزری ہوئی جوانی کے زرنگار خوابوں کی بہار آفریں تعبیر کی متلاشی رہتی تھیں۔ یوں معلوم ہورہا تھا جیسے ایک بڑے غم کا زہر کام و دہن سے گزر کر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہو۔ ایک نامعلوم سا خوف حسینہ پر طاری ہوگیا۔ اسی خوف کو ساتھ لے کر جب وہ فرار و گریز کی پناہ گاہ کی تلاش میں یونیورسٹی پہنچی تو بس اسٹاپ پر فرحت مل گیا۔ شاید وہ بے چینی سے اُس کا منتظر تھا۔ اس کو دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اُٹھا۔ چہرہ یوں چمک رہا تھا جیسے اُس کی روح جان نواز خوشی کا آبِ حیات پی کر جاوداں ہوگئی ہو۔!!

"قصہ ختم ہوگیا حسینہ!" وہ چہکا۔

"کون سا قصہ؟ بات کیا ہے؟"

"خدا نے ممی کو نیک توفیق دے دی ہے" وہ پرمسرت لہجے میں بولا ——————

"راستے کا پتھر ہٹ گیا حسینہ! کل رات میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ یوں ہماری محبت کی تذلیل نہ کریں۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا عزم کر لیا ہے!"

"پھر" حسینہ کا دل دھڑک اٹھا۔

"انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ قائل ہوگئیں" فرحت کی آواز مسرت سے تھرتھرا رہی تھی۔ "انہیں اندازہ ہوگیا کہ اب وہ عمر کے اس حصہ میں داخل ہوگئی ہیں جہاں جوانی کی یادیں دل کو حرارت تو پہنچا سکتی ہیں، مگر جوانی کا کوئی وجود نہیں ہوتا —— شاید اُنہیں اپنی پچھلی غلطیوں پر پشیمانی بھی ہے"

اُس دن فرحت یونیورسٹی میں چہکتا رہا، مگر حسینہ یوں خاموش، کھوئی کھوئی رہی جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو! تھکے تھکے بوجھل احساسات ساتھ لے کر گھر پہنچی تو دیکھا ممی فون پر بڑی سنجیدگی سے گفتگو کر رہی ہے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی مگر اُسے اچانک رُک جانا پڑا۔ اُس نے ممی کو کہتے سُنا۔

"میں تھک گئی ہوں۔ عمر بھی بڑی ہوگئی ہے۔ اس لئے چاہتی ہوں کہ باقیماندہ زندگی سکون سے گھر کی چہار دیواری میں گذاروں۔ سماجی سرگرمیوں کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا اب میرے

بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایسوسی ایشن سے مستعفی ہو رہی ہوں ——اور ہاں —— عنقریب حسینہ کی بھی شادی ہو جائے گی۔"

ممی کی آواز غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ حسینہ کا سر چکرانے لگا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ممی کے ہاتھوں اُس کی فتح اچانک شکست میں بدل گئی ہو!!

راہِ راست

اور تقریر جاری تھی!

"بھائیو! ہم نے آپ کے لئے ہر طرح کے لوازماتِ کارکردگی فراہم کئے ہیں اور کر رہے ہیں۔ سردیوں میں آپ کو گرم کپڑے، آرام دہ بستر اور رضائیاں مفت دی جاتی ہیں، آپ کی جسمانی اور دماغی توانائی برقرار رکھنے کے لئے بسا اوقات فیکٹری آپ کے خاندان کے لئے گھی، شکر اور حتّٰی کہ آٹا تک مہیّا کرتی ہے۔ یہ سب باتیں میں بر سبیل تذکرہ کہہ رہا ہوں۔ اس کا مطلب آپ پر فیکٹری کے احسانات جتانا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ آپ کی تکلیف سمجھتے ہیں۔ ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ فیکٹری میں کام کرنے والوں کی خوش حالی کے لئے اپنی کوششوں کو جاری رکھیں گے ۔۔۔ یہ سب سہولتیں اور آسانیاں آپ کو صرف اسی فیکٹری میں میسّر ہیں لیکن اس کے باوجود آپ لوگوں کا مطالبہ ہے کہ تنخواہ بڑھائی جائے اور .... اور ....."

"مردہ باد!" پنڈال میں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اٹھ کر پُرجوش انداز میں نعرہ بلند کیا۔ سامعین نے چونک کر اسے دیکھا منیجر کی آنکھیں استعجاب کی فراوانی سے پھیل گئیں۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ کسی نے اس کی تقریر کو درخورِ سماعت نہ سمجھ کے تسلسل کو تار تار کر دیا تھا۔ اس کا گول مٹول جسم وافر غصّہ سے سرخ ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ بڑھ کر اس نوجوان کی کھوپڑی پر ایک ایسی لاٹھی رسید کرے کہ وہ ناریل کی مانند دو ٹکڑے ہو جائے۔ مگر نوجوان کو دیکھتے ہی اس کا غصّہ کافور ہو گیا جیسے کسی نے بھڑکتی ہوئی

آگ پر پانی ڈال کر سرد کر دیا ہو۔!!

وہ فخرو تھا۔۔۔ فخرو۔۔۔ جس کی داداگیری سارے فیکٹری کے احاطے میں اظہر من الشمس تھی۔ سیدھے منہ بات کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ اگر کوئی دانستہ طور پر اُس کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتا تو بس جیسے قیامت آجاتی۔ وہ غصّہ سے اُس کی آنکھیں نکال لینے کے درپے ہو جاتا۔ اس لئے بجز اُس کے چند لنگوٹیا یاروں کے اور کوئی اس سے مخاطب ہونے کی جسارت نہ کرتا تھا۔۔ وہ خوب جانتے تھے کہ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنا حماقت ہے۔

آج وہی فخرو پنڈال میں گرج رہا تھا۔۔ !

"منیجر صاحب! آپ نے فیکٹری والوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر رکھ دیئے۔ لیکن کبھی آپ نے ہمارے دکھیا دلوں کی آہیں اور ہماری پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو دیکھے ہیں ہمارے فاقوں سے مرجھائے چہروں کو دیکھنے کی کوشش کی ہے؟ بھلا آپ کو اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ آپ کا مذہب اور ایمان تو صرف تجوریاں بھرنا ہے غریبوں کی محنتوں اور مشقتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ انہیں ظلم و ستم کی چکّی میں پیسنا ہے۔۔۔ چاہے گرمی ہو یا سردی۔۔۔ بارش کا مہینہ ہو یا کڑکڑاتے ہوئے جاڑے۔۔۔ ہم کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے ہیں مشینوں پر کام کرتے کرتے ہماری زندگیاں بھی مشین ہو کر رہ گئی ہیں۔ مگر آپ کو بھلا اس سے کیا غرض! آپ لوگ تو ایر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھنے کے عادی ہیں۔ ہم سے پوچھئے کہ زندگی کیا ہے؟ جب گرمیوں میں فیکٹری کی گھٹی ہوئی فضا اور تاریک ماحول میں مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ میں اپنی آرزوؤں کی چیخیں سنتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ خودکشی کر لیں مگر آپ بھلا تصویر کے اس رخ کو دیکھنے کی کوشش کیوں کریں گے۔ آپ کہتے ہیں ہمارا تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ ناجائز ہے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیوں ناجائز ہے؟ کیا ہمیں حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی ضرورتوں کو پورا کریں؟ مگر یہ کیسے ممکن ہے جب کہ ہم دانے دانے کو محتاج ہیں۔"

منیجر کا چہرہ غصّہ کی تمازت سے شفق گوں ہو گیا مگر اس نے موقعہ کی نزاکت کے پیشِ نظر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بولا۔

"فخرو! تم نے ہمارے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کاش تمہیں ہماری مجبوریوں کا احساس ہوتا! اس سال ہمیں تین لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔ خود ہی سوچو اس صورت میں ہم کس طرح تم لوگوں کی تنخواہ بڑھا سکتے ہیں؟ ہاں اگر حالات سازگار ہو جائیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ فوراً تمہاری تنخواہوں میں اضافہ کر دیا جائے گا۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔ تم ہمیں اُلّو بنا رہے ہو" فخرو وحشیانہ انداز میں چیخ اٹھا "میں نے خود تم کو سیٹھ سے کہتے سنا ہے کہ اس سال تیس لاکھ فائدہ ہوا ہے۔ آئندہ میں اس بے ایمان فیکٹری میں کام نہیں کروں گا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی مشورہ دوں گا کہ وہ بھی یہاں کام نہ کریں۔ یہاں تو صرف غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے۔"

اتنا کہہ کر فخرو تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا پنڈال سے باہر نکل گیا۔ سارے لوگ اس کو تعجب سے دیکھتے رہ گئے کئی منٹ تک لوگوں کی سرگوشیاں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح پنڈال میں کانپتی رہیں مگر اسے کب اس کی پرواہ تھی۔ وہ طمطراق سے کسی نکھٹو اور اڑیل گھوڑے کی طرح گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے آگ معلوم ہو رہا تھا، آنکھیں حلقوں سے باہر نکل رہی تھیں مگر وہ اپنی حالت سے بھی بے نیاز تھا۔ اس کے قدم سڑک کا سینہ کچل رہے تھے اور ذہن خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔۔۔ گلی کے نکڑ پر وہ ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ ایک طویل قامت چرخ سے آدمی نے اس کے کندھے پر اس بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا تھا جیسے اس سے برسوں کی شناسائی ہو!۔

"کون ــــ؟" فخرو نے غرا کر کہا۔ طویل قامت آدمی کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ رینگنے لگی۔ اس کے پیلے پیلے دانت ہونٹوں کے پیچھے سے اس انداز سے جھانکنے لگے جیسے کوئی چھپکلی اپنے بل سے سر نکال کر جھانک رہی ہو!

"میں تمہیں بخوبی جانتا ہوں۔" اس نے تکلّف کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔

"وہ کیسے؟" فخرو نے حیرت سے کہا۔ اجنبی نے اس کے سوال کو سنی اَن سنی کر کے کہا۔

"واقعی تم بہت شاندار نعرہ بلند کرتے ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی شیر کچھار میں دھاڑ رہا ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" فخرو کو اس کے طرزِ تخاطب سے الجھن ہونے لگی۔

"اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ تم نے نوکری چھوڑ دی ـــــ بالکل ٹھیک کیا۔ مجھے تمہارے اس اقدام سے بے حد خوشی ہوئی۔ اگر تم نوکری نہ چھوڑتے تو بھی میں تمہیں اس گندے ماحول میں رہنے نہ دیتا۔" وہ فخرو کی بات کو پسِ پشت ڈال کر اپنی دھن میں کہتا چلا گیا۔

"دیکھو! تمہاری بکواس میری قطعی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ صاف صاف کہو ورنہ ابھی تمہارے مزاج درست کرتا ہوں۔" فخرو نے اس کے شانے کو جھنجھوڑ کر کہا۔

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔" اس نے ملائمت اور حلاوت سے کہا۔ "مجھ پر اعتماد رکھو۔ فیکٹری والوں کی طرح میں تمہارے جذبات کو ٹھیس نہیں لگاؤں گا۔ میرا کام راہ بھٹکے مسافروں کو منزل تک پہنچانا ہے۔۔! سمجھ گئے نا؟ اس وقت میں تم سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"معاہدہ! کیسا معاہدہ؟" فخرو نے تحیّر آمیز سنجیدگی سے کہا۔

"ایک ایسا معاہدہ جو تمہاری زندگی میں خوشی کا پیغام لائے گا۔ جو تمہارے دکھ درد کا خاتمہ کر دے گا ـــ لو ـــ یہ سگریٹ پیو۔" اس نے ایک اعلیٰ قسم کی سگریٹ فخرو کو پیش کی جو اس نے اس سے پہلے کبھی پی نہ تھی۔ پھر خلیق لہجے میں بولا۔ "آؤ پہلے کسی ہوٹل میں چل کر بیٹھیں۔ وہاں میں تمہیں تفصیل سے ساری باتیں سمجھاؤں گا۔"

فخرو چپ چاپ کسی سحر زدہ کی مانند اس کے پیچھے ہو لیا۔ یہ وہی فخرو تھا جو کسی کی ٹیڑھی نظر تک برداشت نہ کر سکتا تھا مگر اب وہ اس وقت اجنبی کے پیچھے اس انداز سے چل رہا تھا جیسے اس کا زر خرید غلام ہو!

دونوں قریب کے ایک ہوٹل میں داخل ہوئے۔ اجنبی نے دو اسپیشل چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آنے کے بعد وہ فخرو سے بولا۔ "نوکری تو تم چھوڑ ہی چکے ہو۔ اس صورت میں تم بیکار ہی ہو گئے؟"

"ہاں۔ مگر تم ـــــ"

"فکر نہ کرو ابھی ساری باتیں سمجھاتا ہوں" اجنبی نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دی۔ "تم ہماری لیگ کی ملازمت قبول کرلو۔"

"کام کیا ہے؟"

"صرف نعرے لگانا!"

"نعرے لگانا!!" فخرو نے اجنبی کو اس انداز سے دیکھا جیسے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔

"مذاق نہ سمجھو۔ یہ کام بہت آسان ہے۔" اجنبی نے اس کے چہرے سے اس کی دلی کشمکش کو بھانپ کر کہا۔ "تم جانتے ہو کہ آئے دن شہر میں جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ تم سے جو کہا جائے اس پر عمل کرو" مردہ باد" کے نعرے کو کہا جائے تو مردہ باد کے نعرے لگاؤ اور اگر" زندہ باد" کے نعرے لگانے کو کہا جائے تو ـــ"

"زندہ باد کے نعرے لگاؤں ـــ کیوں؟" فخرو نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر اس کا نامکمل جملہ مکمل کردیا۔

"بالکل ـــ تم سمجھ دار ہو ـــ جلد سمجھ گئے۔"

"تنخواہ کیا ہوگی؟"

"جس جلسے میں تم شریک ہوگے اس کے دو سو روپے ملیں گے۔"

"ایک جلسے کے دو سو؟" فخرو نے تعجب سے پوچھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ شاید اجنبی اس سے مذاق کر رہا ہے کیونکہ اتنی خطیر رقم تو اُس کو کئی روز کی محنت اور عرق ریزی کے بعد ملتی تھی!

"کیوں کیا کم ہے؟ چلو تین سو روپے ملیں گے" اجنبی نے اتنا کہہ کر اس کی حیرت میں اضافہ کردیا۔

"مجھے منظور ہے۔" اس بار فخرو نے اپنی حیرت کو دبا کر کہا۔

"میں فی الحال تم کو تین جلسوں کی پیشگی رقم دیتا ہوں۔" اس نے جیب سے سو سو روپے کے نوکرکڑاتے نوٹ نکال کر فخرو کی طرف بڑھا دیئے اور چائے کی پیالی خالی کرکے ایک طرف رکھ دی۔ نوٹوں کو دیکھ کر فخرو کے منہ میں

یاتی آگیا۔ اسے دنیا کی ہر شے میں مسرت اور شادمانی کے طرب آگیں نغمے سنائی دیئے۔ اس کے کانوں میں اَن گنت گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"دستخط کی بھی تو ضرورت ہو گی"۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کے ذہن میں تعیشات کے ساز و سامان ناچ رہے تھے۔

"اوہ مجھے تم پر بھروسہ ہے!"

"لیکن ۔ لیکن ۔۔۔" اس بار اس کے دل میں ایک سرگوشی ابھری۔

"ہاں ہاں کہو ۔۔۔"

"میں ایسے جلسے میں نہیں جاؤں گا۔ جہاں میرا ضمیر جانا نہیں چاہے گا"۔۔۔ اس نے دل کی بات کہہ دی۔ طوفانی دریا کا بند ٹوٹ گیا۔

"میں سمجھا نہیں"۔ فخرو کو اجنبی کی تیز نگاہوں میں بجلیاں ناچتی نظر آئیں۔

"میں ۔۔۔ میرا مطلب ہے میں امیروں کی تائید میں نعرے نہیں لگاؤں گا"۔ اس نے آنکھیں زمین بوس کر کے کہا۔

"کیوں ؟"

"اس لئے کہ مجھے ان سے نفرت ہے"۔

"تم بڑے بھولے ہو"۔ اجنبی کی آواز میں شیرینی تھی "زمانہ بدل گیا مگر تم ویسے کے ویسے ہی ہو ۔۔۔ تم کو دولت سے نفرت ہے۔ جب کہ یہی چیز آدمی کو آدمی بناتی ہے مجھے دیکھو ۔۔۔ پہلے میں بھی تمہاری طرح امیروں کے محلوں کو گرا دینا چاہتا تھا۔ مگر اس سے ان کا وجود تو ختم نہ ہو سکا اور میں بھوکوں مرنے لگا۔ اور پھر مجھے ضمیر کا گلا گھونٹ دینا پڑا۔ اُس وقت میرے ذہن میں ایک بات تھی کہ کسی طرح دولت مند بن جاؤں۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ دولت بذاتِ خود بُری نہیں ہے بلکہ اس کی تقسیم غلط ہوئی ہے وہ غلط آدمیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور پھر اس کی ویسی ہی حالت ہو گئی جیسے ایک پاکباز عورت کی عیاشوں کے دربار میں اکر ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ دولت مند بن جانے کے بعد دولت مندوں کے طریقِ عمل کو ختم کر دیں۔ اس سے اچھے کام لیں۔ اب مجھے غور سے دیکھو! اس وقت میں شہر کا متموّل اور باعزت

آدمی ہوں۔ کوشش کرو اور دولت حاصل کرو۔ پھر اس سے جتنا عیش کرنا چاہو کرو۔ کیونکہ زندگی دو روزہ ہے۔"

اجنبی کی تقریر کے نقوش فخرو کے ذہن پر ثبت ہو گئے۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "دولت بُری شے نہیں ہے۔ آجکل کے دولت مند بُرے ہیں۔ اس لئے تم بھی کسی طرح دولت حاصل کر کے غریبوں اور ناداروں کی امداد کرو۔ دنیا کے سامنے ثابت کردو کہ دوسرے سرمایہ داروں کی طرح تم بُرے نہیں ہو تم میں مفلس اور قلاشوں کے لئے ہمدردی اور محبت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ کوشش کرو۔ ایسا سنہری موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا" فخرو نے دل کی بات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کی نظروں کے آگے اپنی عزیز بیوی اور معصوم بچوں کی صورتیں گھوم گئیں۔ نکبت و دلدر کے سبب مرجھائے ہوئے زرد چہرے جو چیخ چیخ کر اس کے خلاف نعرۂ ہائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔

"تم نے آج تک ہماری کوئی آرزو پوری نہیں کی"

"تم نے ہمارے جائز مطالبات کو سختی سے ٹھکرا دیا"

"تم ہمارے ارمانوں کے قاتل ہو"

فخرو کا دل الجھن اور کشمکش کی سنگلاخ دیواروں سے ٹکرانے لگا۔

"کیوں ــــ سوچ لیا ــــ" اجنبی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر اس منحنی سے آدمی کو دیکھا جو اس کے لئے آرام اور عیش کا پیغام لایا تھا۔ اسے خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولنے کی دعوت دے رہا تھا۔

"مجھے منظور ہے"۔ فخرو کی آواز بوجھل تھی جیسے اُس آواز پر دنیا کے مصائب اور آلام کا بہت اونچا ملبہ پڑ چکا ہے اور اس ملبے کے اندر اس کے کتنے ہی رنگین سپنے، البیلی آرزوئیں اور بہت سارے مترنم قہقہے دفن ہو کر رہ گئے ہوں۔ وہ نہ جانے کیوں اپنے آپ کو برسوں کا بیمار محسوس کرنے لگا۔ ایک انجانی سی خلش تیر بن کر اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ نہ معلوم کیوں اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ راہ راست سے بھٹک گیا ہو۔ اس نے اپنا وجود گہری تاریکیوں اور عمیق پستیوں میں گرتا ہوا محسوس کیا۔ اسے بہت

دور سے اجنبی کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا۔

"پرسوں گرین پارک میں خان بہادر افضل خان عوام سے خطاب فرمائیں گے۔ تم وہاں پہلے ہی جاکر بیٹھ جانا اور ان کی تقریر کے دوران ان کے حق میں زندہ باد کے نعرے لگاتے رہنا۔ سمجھ گئے نا ــــ!"

اجنبی کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ مگر فرخ اضطرابی انداز میں چائے کی پیالی کی تہہ میں پڑی ہوئی تلچھٹ کو دیکھتا رہا جیسے وہ بھی اُس کی ذہنی کشمکش کی ایک وجہ ہو۔ کوئی ہلکی سی مبہم آواز اُس کو لعن طعن کر رہی تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ روپیہ ملنے پر بھی ایک خلش اور نامعلوم اداسی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ لوگ تو روپیوں کے تصور ہی سے جھوم اٹھتے ہیں ــــ" مگر وہ اس عقدۂ لاینحل کو حل نہ کر سکا تھا۔ جب وہ گھر کی سمت چل رہا تھا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے جیسے اس کے سر پر گناہوں کی گٹھری رکھ دی گئی ہو ــــ گھر پہنچتے پہنچتے اس کی طبیعت بحال ہو گئی اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلا لیا کہ زندگی کی محفل کو حسین اور رنگین بنانے کے لئے دولت کی ضرورت ہے۔ جب آدمی کو زندگی گزارنی ہے تو کرّوفر اور شان وشوکت سے کیوں نہ گزارے۔ دنیا میں آدمی صرف ایک ہی بار تو آتا ہے اگر اس کی زندگی آہوں اور آنسوؤں کے گرداب میں ہچکولے کھاتی رہے تو پھر دنیا میں آنے سے کیا فائدہ ــــ؟

گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے فرزانہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"آٹا ختم ہو گیا ہے۔ سن رہے ہو۔؟"

"دودھ والا اور سبزی والا اپنا حساب مانگ رہا تھا۔"

اس کو دیکھتے ہی فرزانہ نے کہنا شروع کر دیا۔ پہلے ہی الفاظ اُس کو جھلاہٹ اور غصے سے ہم کنار کر دیتے تھے۔ اس کے دل میں بغاوتوں کے طوفان اٹھا دیتے تھے۔ اس کے ذہن میں امیروں کا تصور آجاتا تھا جن کے کان ہمہ وقت دولت کی جھنکار سے آشنا رہتے تھے۔ پھر اسے خدا کی وحدانیت اور رحیم ہونے پر شبہ سا ہونے لگتا تھا۔ وہ سوچتا یہ کیسا خدا ہے جو امیروں اور غریبوں میں تفاوت پیدا کر کے اپنے کو خوش کرتا ہے مگر آج اس کے دل

میں سویا ہوا غصہ بیدار نہ ہو سکا۔ وہ مسکرا دیا۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ ساون کے بادل کی طرح جھوم اٹھا۔

"بڑے خوش نظر آرہے ہو۔" فرزانہ نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرادی۔

"بات ہی ایسی ہے سنوگی تو ناچ اٹھوگی۔"

"اچھا تو پھر جلدی سناؤ۔" فرزانہ کا لہجہ اشتیاق سے بھر پور تھا۔

فخرو نے من و عن سارا قصہ اسے سنا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ فرزانہ اس مژدہ جانفزا کو سن کر کیف و انبساط، سرور و بہجت کے جذبات سے معمور ہو کر جھوم جھوم اٹھے گی۔ مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"تمہیں یہ رقم نہیں لینی چاہیے تھی۔"

"تو کیا ہم بھوکے مر جاتے۔" فخرو کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا۔

"یہ ناجائز روپیہ ہے۔"

"جو روپیہ آدمی کو سکون دیتا ہے وہ بعد میں خود بخود جائز ہو جاتا ہے۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو۔" فرزانہ کی آواز میں حیرت سے زیادہ اداسی تھی۔

"کیا تمہیں شک ہے؟"

"ہاں کیونکہ چند روز پہلے تم کہا کرتے تھے کہ حرام کی کمائی سے موت بہتر ہے۔"

"زمانہ بدل گیا! اور اس کے ساتھ ہی میں بھی بدل گیا ہوں!"

"تو گویا تمہارا ضمیر مر گیا ہے؟"

فرزانہ کا جملہ نشتر بن کر فخرو کی رگِ حمیت میں چبھ گیا۔ اس کے چہرے پر روحانی کرب کے نقوش پیدا ہو گئے اور اس کی آنکھوں کے کونوں پر آنسوؤں کے چند اداس قطرے پھسل گئے۔ اگر کوئی ایسا کہنے کی جرأت کرتا تو شاید فخرو اس کا سر پھوڑ دیتا۔ مگر فرزانہ سے اس کو بے حد محبت تھی۔ اس کے دل کے اتھاہ ساگر میں فرزانہ کی محبت کے انمول موتی ہر دم جگمگاتے تھے۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور بوجھل قدموں سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا کیونکہ خان بہادر افضل خاں عوام کے محبوب لیڈر تھے۔ ان کی آواز قوم کی آواز تھی ملک اور قوم کی بے لوث خدمت ان کا کیش تھا اور انہیں مہتم بالشان صفات نے اُنہیں ایک عظیم پبلک لیڈر بنا دیا تھا۔ جب وہ جلسے کے منتظمین کی معیت میں ڈائس پر آئے تو پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ہر طرف سے خان بہادر زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ان سب پر فخرو کی آواز بھاری تھی۔ خان بہادر شانِ استغنار سے چلتے ہوئے صدارتی کرسی پر جلوہ افروز ہو گئے۔ سر پر ٹوپی، سفید اور بے داغ شیروانی، ہاتھوں میں چھڑی ـــ وہ مسکرا مسکرا کر مجمع کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ہاتھ اٹھا کر وہ حاضرین کے جوشِ عقیدت کا جواب دے دیتے تھے۔

سب سے پہلے سکریٹری نے ابتدائی کارروائی کے بعد بصد آداب و احترام خان بہادر سے تقریر کی درخواست کی جو فوراً منظور کر لی گئی۔

جوں ہی وہ مائیک پر تشریف لائے فخرو نے حلق پھاڑ کر "خان بہادر زندہ باد" کا پُر جوش نعرہ بلند کیا۔ وہ ڈائس کے بالکل قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اتنا قریب کہ خان بہادر اس کی آواز پر چونک کر گھورنے لگے۔ کیونکہ فخرو کی آواز پنڈال میں اس طرح گونجی تھی جیسے کسی شیر کی گرجدار آواز جنگل کا سینہ چیرتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو جائے۔

خان بہادر نے تقریر شروع کر دی۔ تقریر کیا تھی بس اپنی برسرِ اقتدار پارٹی کی پُر جوش الفاظ میں مدح سرائی تھی۔ وہ اپنی شعلہ بیانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومتِ وقت کی پالیسیوں کے باب میں رطب اللسان ہو رہے تھے! انہوں نے ببانگِ دہل کہہ دیا کہ صرف انہیں کی سیاسی جماعت ملک اور عوام الناس کی ترقی اور خوشحالی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

ایک لمحہ کے لئے فخرو کا ذہن سوچنے کی عملی صلاحیتوں سے مستعفی ہو کر رہ گیا۔ اُسے سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ مگر وہ یہ خوب جانتا تھا کہ خان بہادر کا تعلق جس سیاسی جماعت سے تھا وہ بکے ہوئے سیاست دانوں اور بے کردار سرمایہ داروں کا ایک سازشی ٹولہ ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر مختلف تعصبات کو ہوا دے کر ملک کے معصوم عوام کو ایک دوسرے سے لڑایا تھا۔ ان کی خود غرضانہ پالیسیوں

کے سبب آج ملک کے ہر کونے میں طوائف الملوکی جیسی کیفیت تھی۔ بدامنی اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں کی جان، مال اور عزت سب خطرے میں تھی ___ یہ تقریر سن کر فخرو نے وحشیانہ انداز میں اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبالئے۔ "میں کبھی اس تقریر کی موافقت میں نعرے نہیں لگاؤں گا۔" اس نے دل میں سوچا مگر دوسرے ہی لمحے تو سو روپے کے کڑکڑاتے ہوئے نوٹ اس کے تصور میں رقص کرنے لگے۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچتا ایک زمین اور آسمان ہلا دینے والا نعرہ اس کی زبان سے پھسل کر فضا میں بلند ہو گیا۔ "خان بہادر ___ زندہ باد"

مگر دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نعرے نے ہتھوڑے کا روپ اختیار کر کے اس کی غیرت و حمیت پر مسلسل ضربیں لگانا شروع کر دیا ہو۔ اس کے قریب بیٹھا ہوا ایک آدمی اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

"چند روز پہلے یہی آدمی سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ مگر اب....."

یہ جملہ نہ جانے کس طرح فخرو کے کانوں میں گھس گیا۔ اس کے دل پر زبردست چوٹ لگی۔ اس کا ذہن گھومنے لگا۔ خان بہادر طوفانی جملوں کے دریا بہا رہے تھے۔ مگر فخرو کو ایسا لگا جیسے وہ اس کی ماں بہنوں کو گالیوں اور مغلظات سے نواز رہے ہوں۔ اس کا پنڈال میں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی چلا تھا کہ کسی نے اسے آواز دی۔ وہ پلٹ پڑا۔ سامنے اجنبی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"بہت خوب، بہت خوب!! تم نے کمال کر دیا۔ نعرے لگانا اسے کہتے ہیں۔" اس نے ایک لمحے تک اجنبی کو دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے اس کا سیدھا ہاتھ چل گیا۔ اجنبی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب وہ اپنا گال سہلا رہا تھا۔

"کمینے یہ لو اپنی رقم!" اس نے نوٹ اجنبی کی طرف اچھال دیئے۔ "تم نے مجھے خریدنے کی کوشش کی تھی۔ میرے خیالات کو قید کرنا چاہتے تھے۔ تم ذلیل ہو۔" اتنا کہہ کر فخرو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے قدم راستہ بھٹکنے کے بعد پھر راہ راست پر آ گئے ہیں۔ دل پر رکھا ہوا بوجھ ہٹ گیا تھا!

شکار اور شکاری

میں چونک اٹھا!
کسی نے پیچھے سے بش شرٹ کا کونا پکڑ کر بڑی بیدردی سے کھینچ دیا تھا۔ جیسے کوئی کوچوان نکھٹو اور اڑیل گھوڑے کی لگام کھینچ کر اُسے روکنے کی کوشش کرتا ہو۔ میں بُری طرح جھنجھلا اٹھا۔ مخاطب کرنے کا یہ بھونڈا طریقہ مجھے گراں گذرا۔
"کون ——؟" میں طوفان کی طرح پلٹ پڑا۔
"ساب! ایک روپیہ!" سامنے ایک زرد رو لڑکی اپنا دریدہ دامن پھیلائے کھڑی تھی۔ اُس کا نحیف و نزار وجود کسی خزاں رسیدہ کھوکھلے درخت کی مانند لرز رہا تھا۔ آنکھیں ہلدی کی طرح پیلی تھیں اور لباس مجنوں کا لباس بنا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میرا دل رحم اور ہمدردی کے وافر جذبات سے پسیجا۔ میں غیر ارادی طور پر اس سے پوچھ بیٹھا۔
"روپیہ لے کر کیا کرو گی؟" میرے انداز میں پہلی سی کرختگی نہیں تھی۔
"چراغ میں تیل نہیں ہے اور مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے!" اس نے کچھ اس معصومیت سے کہا کہ میرا دل پسیج گیا۔ بے چاری لڑکی! اسے تاریکیوں سے خوف آتا ہے! کاش وہ غربت و نکبت کے پر ہول اندھیروں کی پروردہ نہ ہوتی! مجھ کو خیالوں میں گم پاکر وہ آگے بڑھنے لگی شاید اس نے سمجھا یہاں دال گلنی مشکل ہے
"ذرا ٹھہرو!" میں نے اسے آواز دی۔ وہ رک گئی اور مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو "نہ بھیک ہی دیتے ہو اور نہ جانے ہی دیتے ہو۔ کیوں ایک غریب سے مذاق

کر رہے ہو؟"

"لڑکی تمہارا کیا نام ہے؟" میرے استفسار پر اس نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

"تم کو نام سے کیا لینا ــــــ؟" اس نے درشتی سے کہا پھر نہ جانے کیوں دوسرے ہی لمحہ وہ موم کی طرح نرم پڑ گئی۔ شاید اُس کو اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہو گیا تھا۔

"میرا نام زیبن ہے۔"

"جناب ۱۲ سالہ لڑکی کو پھانس رہے ہیں۔ واہ ری دُنیا! اب تو فقیروں کی عزت بھی خطرے میں ہے۔" قریب سے گزرنے والوں میں سے کسی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ اور پھر دونوں ہنس پڑے۔ میں بھلا اُن کی طرف پلٹا مگر وہ دونوں کافی دور نکل چکے تھے۔ میں دل ہی دل میں کھول اٹھا۔ کتنی گندی ذہنیت رکھتے ہیں اس زمانے کے لوگ بھی!" ان کی کوتاہ نظری اور ذہنی دیوالیہ پن پر میں ماتم کرنے لگا۔

دفعتاً میں چونک پڑا۔ لڑکی عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"لڑکی مجھ سے مت ڈرو۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو۔" زیبن نے خشک لہجے میں کہا۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

"سب یہی کہتے ہیں بابو جی! کیوں کہ ایسا کہنے سے کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اور جب مدد کا وقت آتا ہے تو سب بھاگ جاتے ہیں۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ لئے۔ اس کی راست گوئی اور لہجے کی بیباکی پر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"نہیں! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اپنے حالات صحیح صحیح بتاؤ تاکہ مجھے تمہاری مدد کرتے وقت مشکل نہ ہو!"

"مدد کرتے وقت کیسی مشکل ہوتی ہے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"تم ابھی بچی ہو نا ــــــ؟ اس لئے ایسی باتیں نہیں سمجھ سکتیں۔" میں اس کی پریشانی اور ذہنی ژولیدگی بھانپ کر مسکرا دیا۔ "فرض کرو کہ تم دس روپے کی مستحق ہو اور میں تمہیں پانچ روپے دوں تو ظاہر ہے مجھے افسوس ہو گا کہ تمہیں میں نے دس روپے کیوں نہیں دیئے مجھ

گئی ہونا ـــــ؟

"سمجھ گئی" وہ متانت سے بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ تم رہتی کہاں ہو؟" نہ جانے کیوں مجھے اس سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور نہ معلوم کس جذبے کے تحت میں اُس کے ذاتی معاملات میں دخل انداز ہو رہا تھا۔ جواب میں اُس نے اُس بستی کا نام لیا جہاں زندگی کی تمام تلخیوں کو سینے سے لگائے نیم روشن کثیف جھونپڑیوں میں لوگ بستے تھے۔

"تمہارے ساتھ اور کون رہتا ہے؟"

اِس سوال پر اُس کی آنکھیں بھر آئیں، چہرے پر پھیلی ہوئی زردی میں اضافہ ہو گیا۔

"صرف بابا!" اُس نے آنچل کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اور وہ بھی بہت بیمار ہیں۔"

"تمہاری آمدنی کیا ہے؟"

"آمدنی" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "بابو جی آمدنی تو صرف امیروں کی ہوتی ہے۔ بھکاریوں کی آمدنی تو صرف بھیک ہوتی ہے۔" اس کی بات سن کر مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اُس سے ایک احمقانہ سوال پوچھ لیا تھا! میرا سر یوں جھک گیا جیسے ان کی مفلوک الحالی، ان کی ناگفتہ بہ حالت کا باعث میں تھا۔ میں نے جلدی سے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"اچھا زیبن! میں تمہارے بابا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"بابو آپ!" اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرا دماغی توازن بگڑ گیا ہو! "بابو جی بے شک ہم فقیر ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر ایک ہمارا مذاق اڑائے۔" اس کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبریز ہو گئے۔

"تم اُسے مذاق سمجھ رہی ہو زیبن! حالانکہ میں تمہارے بابا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مگر ـــــ مگر وہ جگہ بہت گندی ہے۔"

"کوئی پرواہ نہیں!" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی بابو!"

پھر میں اس کی قیادت میں چل پڑا۔ ہم جدھر چل رہے تھے وہاں آدمی کم اور کوڑا کرکٹ اور گندگی زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ تعفن، سڑاند اور بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ بعض دیواروں پر جلی حروف میں رقم تھا "یہاں پیشاب کرنا سخت منع ہے" اور شاید اسے حسنِ اتفاق ہی کہا جائے گا کہ وہاں پیشاب کے نشانات کے علاوہ غلاظت بھی بکھری ہوئی تھی۔ اور دو تین بچے اکڑوں بیٹھے قمیض اُٹھا کر پاخانہ کر رہے تھے!

تھوڑی دور چل کر جھونپڑیوں کی قطاریں شروع ہو گئیں جن کا لامتناہی سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ جھونپڑیوں کے آگے میلے کچیلے کپڑوں سے بے نیاز معصوم بچے انجانے کھیل رچا رہے تھے۔ بعض تو مٹی کے چھوٹے چھوٹے لڈو اس طرح مزے لے لے کر کھا رہے تھے جیسے وہ رس گلے ہوں۔ ان کی اس بے چارگی پر مجھے ترس آ گیا۔ ایک گلی کے پاس تو میرے قدم خود بخود رک گئے۔ کوئی ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو لوری کے ذریعہ چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوری کے بول اتنے غم انگیز اور اُداسی سے مملو تھے کہ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ میں پھر لڑکی کے ہمراہ بڑھنے لگا۔ اس وقت میرا دل جذبات کے تموّج اور احساسات کی یورش سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں سوچ کے ساگر میں ڈوب گیا۔ کیسی بے نام سی سوچ تھی وہ بھی جس کا سلسلہ اس گندی آبادی کے باسیوں کی المیہ زندگی ہی پر ختم ہو رہا تھا۔

دفعتاً میرے خیالات بکھر گئے! جیسے سطحِ آب پر بڑی ہی ہم آہنگی سے بہتی ہوئی کشتی اچانک کسی بھنور میں پھنس کر ڈگمگانے لگے۔ ہمارے قدم ایک شکستہ جھونپڑی کے سامنے آ کر رک گئے تھے جس کی زبوں حالی کسی بھی سخت گیر انسان کے دل میں بے اختیار جذبۂ ترحم کو ابھار سکتی تھی۔ جھونپڑی مٹی کی تھی۔ دروازے کی جگہ ایک بڑا سا خلاء تھا جس میں ایک ٹاٹ کا پردہ لہرا رہا تھا۔ چھت پر جگہ جگہ درزیں، رخنے اور سوراخ تھے جن کو درست کرنے کے لئے ان میں گھاس پھوس کے پیوند لگا دیئے گئے تھے۔ اندر سے کسی کی مستقل کھانسنے کی آواز آ رہی تھی اور جب چند لمحوں بعد کھانسی کی آواز رکتی تو پُرسکون فضا کا سینہ چیرتے ہوئے، زمانے کے حوادث اور مستقل جان لیوا بیماری سے بولائی ہوئی آواز گونجتی۔

"ہائے رے زندگی ــــ کاش ہم پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے ــــ ہائے ــــ"

"ہم یہاں رہتے ہیں" زرین نے شکستہ حال جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "بابو اندر آؤنا؟"

"کس کو بلا رہی ہو زرین" اندر سے کسی کی نحیف آواز آئی۔

"بابو تم سے ملنا چاہتے ہیں بابا ——"

"مجھ سے !!" آواز میں تعجب تھا "بھلا دنیا میں میرا کون ہے؟ میں تو سمجھا تھا کہ شائد دنیا مجھے بھول ہی گئی —— خیر بلالو، اگر وہ آسکتے ہوں تو ——"

ٹاٹ کا شکستہ بورا اٹھا کر میں جھونپڑی میں داخل ہوا۔ یہاں کی تو دنیا ہی عجیب تھی! ایک لمحہ کے لئے مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا وجود دنیا جہان سے کٹ کر ڈراؤنے خواب کی لِس بھری فضاؤں میں پہنچ گیا ہو! ایک کونے میں بوسیدہ سے ٹاٹ پر کوئی منحنی سا بوڑھا بیٹھا بُری طرح کھانس رہا تھا۔ کھانسنے کی وجہ سے اُس کا سینہ دھونکنی کی کی مانند تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ گردن کی رگیں تن گئی تھیں اور زبان اُس کتے کی طرح باہر نکل آئی تھی جو جون کی قیامت خیز گرمی اور لُو کے ظالم تھپیڑوں سے بچنے کے لئے جائے پناہ کی تلاش میں سنسان سڑکوں پر گھومتا رہتا ہے —— مجھ کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"بیٹھئے —— بیٹھئے!" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ ہڈیوں کا پنجر تھا۔ جیسے اپنے وجود کا بس سایہ ہی! یا کوئی خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ درخت جس کی جڑیں دیمک نے مسلسل چاٹ کر کھوکھلی کر دی ہوں —— میری عقابی نگاہوں نے جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ ساری چیزیں ان کی بے ترتیب زندگی کی طرح اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک مٹکا دھرا تھا۔ اس کے برابر ایک ٹوٹی پھوٹی ٹوکری تھی جس میں کرم خوردہ کاغذات اور ٹوٹے پھوٹے ڈبے رکھے ہوئے تھے اور اس کے بالکل ہی قریب ایک زنگ خوردہ صندوق تھا —— یہ تھی جھونپڑی کی کل کائنات! میں پتلون کی کریز اور استری کی پرواہ کئے بغیر اُس کے برابر ہی بیٹھ گیا

"کیسے تکلیف کی بابو جی آپ نے!" اس نے کھانستے ہوئے بلغم جھونپڑی کے اندر ہی اُگلتے ہوئے کہا لمحہ بھر میں لاتعداد مکھیاں بلغم کے گرد دائرہ کی صورت میں بیٹھ گئیں۔ اس

منظر کو دیکھ کر میری طبیعت اُکھڑنے لگی۔ بمشکل میں نے خود کو سنبھالا۔

"زیبن کی زبانی مجھے سارے حالات کا علم ہوا بابا! میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کچھ مدد کروں!"

"مدد !!" یکایک بوڑھے نے گرج کر کہا۔ "آپ میری مدد کریں گے۔ مگر کیوں؟" اس کا لہجہ تلخ اور زہریلا تھا۔ اس نے پھر زیبن کی طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھا۔

"کیوں ری ـــــ تو انہیں یہاں کیوں لائی؟ کیا ہماری غربت اور مجبوری کا تماشہ دکھانے؟"

"بابا! میں انہیں نہیں لائی۔" زیبن نے لرزہ براندام ہو کر کہا ـــــ

"تو کیا وہ جادو کے نقشے کی مدد سے یہاں آئے۔"

"بابا! آپ زیبن کو کچھ نہ کہئے۔ اس کا قصور نہیں۔ اس نے تو منع کیا تھا مگر میں زبردستی اس کے ساتھ چلا آیا۔" میں نے مداخلت کر کے کہا۔

"تاکہ ہماری مدد کرو۔" اس کی دھندلی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔

"جی ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"مگر میں آپ کی مدد قبول نہیں کر سکتا۔ آپ میری مدد کرنے سے قبل اُن لاوارث اور سسکتے ہوئے انسانوں کی مدد کیجئے جو فٹ پاتھ پر پیدا ہوتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر اپنی زندگی کے دن گزارتے ہیں اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیتے ہیں ـــــ میری حالت درست ہونے سے سارے غریب خوشحال نہیں ہو سکتے۔" اُس نے جوشیلے انداز میں کہا۔ پھر اتنی دیر باتیں کرنے سے اُس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ وہ بہت دیر تک سینہ پکڑ کر کھانستا رہا۔ کھانستا رہا۔ پھر بلغم اگلتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

"نہ مرتا ہوں ـــــ نہ اچھا ہی ہوتا ہوں۔ لعنت ہے اس زندگی پر!" اُس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلتی معلوم ہو رہی تھیں۔

"آپ علاج کیوں نہیں کرتے بابا ـــــ یہاں سول ہسپتال بھی تو ہے۔"

"علاج !!" میری بات پر وہ تلخی سے بولا۔ "بابو جی علاج صرف امیروں کا ہوتا ہے۔ ہسپتال، ڈاکٹر اور دوائیں سب ان کے لئے ہیں۔ اگر ہم جیسے غریبوں کا علاج ہوتا تو فٹ پاتھ

پر لاوارثوں کی لاشیں پڑی نہ ہوتیں۔" ان طنزیہ باتوں کی میں تاب نہ لا سکا۔ میرا سر ندامت اور خفت سے یوں جھک گیا جیسے درحقیقت میں ہی مجرم تھا۔ جیسے افلاس کے ماروں کی دگرگوں اور ناگفتہ بہ حالت کا ذمہ دار میں اور صرف میں تھا۔ میں نے باتوں کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"بابا! آپ زبین کو کسی اسکول میں کیوں نہیں داخل کرتے؟" اس کی پیشانی پر متوازی شکنیں نمودار ہوگئیں۔ ایک مرتبہ پھر اُس کو کھانسی کا دورہ پڑا ــــ میں نے چور نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں برابر مجھے گھورے جا رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

"غریبوں کو علم کی ضرورت نہیں۔ ہمیں روشنی کی ضرورت نہیں۔ ہم اندھیروں کے پروردہ ہیں، ہمیں اندھیاروں میں پڑے رہنے دو۔ لیکن خدا کے لئے ہم کو روٹی دو ــــ روٹی دو ــــ علم کا دُرِ خوش آب ہمارے ذہنوں کے تاریک گوشوں کو درخشاں تو کر سکتا ہے مگر ہمارے شکم کی آگ فرو نہیں کر سکتا!! خدا کے لئے ہمیں روٹی دو۔"

اب میرا وہاں بیٹھنا دوبھر ہوگیا۔ اُف!! آج پہلی مرتبہ میں نے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ جھونپڑیوں کی کثیف فضا میں سسکتی، تڑپتی، مچلتی زندگی کو!! آج پہلی بار میرے کانوں نے ناتمام حسرتوں اور ناکام آرزوؤں کی دردانگیز داستان کو سنا تھا۔ میں نے سوچا کیا یہی زندگی ہے؟ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چپکے سے میرے کانوں میں کہہ رہا ہو۔ ہاں!! اسی کو زندگی کہتے ہیں۔ اطلس و کمخواب، زربفت و سنجاب میں ناچنے والی زندگی زندگی نہیں بلکہ جھونپڑیوں کے تاریک ماحول میں موجود ناتمام اور موہوم آرزوؤں کے جواں مزاروں کو ہی زندگی کہتے ہیں۔"

میں نے جیب سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکالے اور بوڑھے کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بابا! اللہ اسے قبول کر لیجئے۔ اسے مدد نہیں بلکہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے لئے ایک حقیر تحفہ سمجھئے۔"

بوڑھے نے ویران نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ دو آنسوؤں کے موٹے سے قطرے اس کے رخساروں پر بہہ گئے۔ اس بار اس نے کچھ نہیں کہا۔ چپکے سے لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر

نوٹ لے لئے۔

"شکریہ بابا! اب مجھے اجازت دیجئے۔ پھر کبھی آؤں گا۔"

جانے سے قبل میں نے شفقت سے زبین کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ اس لمحے میرا ذہن بس بھری سوچ کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور بوجھل سناٹوں کے حصار میں دل کی بے چین دھڑکنیں رک رک کر تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ابھی میں کچھ دور چلا بھی نہ تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔ بوڑھا کھانستا ہوا زبین سے کہہ رہا تھا۔

"شاباش زبین! اگر تو روز اس قسم کے بیوقوفوں کو یہاں پھانس کر لائے تو ہماری اچھی گذرے گی۔ ان ہی کے بھائی بندوں نے ہمیں اس حال تک پہنچایا ہے۔ ان کی جیبیں خالی کرنا ثواب ہے اور ــــ اور یہ آدمی تو مجھے اُلو کا پٹھا لگتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر کھانسنے لگا۔ کھانستا رہا۔ کھانسی شدید سے شدید تر ہوتی گئی کھانسیوں کے اس غلیظ طوفان میں مجھے محسوس ہوا جیسے میں سر سے لے کر پیر تک ڈوبتا ہی جا رہا ہوں! تاریکیوں میں، نشیب میں ــــ جیسے کسی بلند چوٹی سے لڑھکا دیا گیا ہوں۔ میں نے بونقوں کی مانند مڑ کر جھونپڑی کو دیکھا۔ اس وقت میں سچ مچ اپنے آپ کو اُلو کا پٹھا محسوس کرنے لگا تھا!

بہن کی گالی

میں اس محلے میں نووارد ہوں۔

میری حیثیت ایک اجنبی سے زیادہ نہیں۔ میں سب کے لئے اور سب میرے لئے ناآشنا ہیں۔ غیریت اور بیگانگی نے میرے اور محلے والوں کے درمیان حدِ فاصل کھینچ دی ہے جسے پار کرنے کی کسی جانب سے کوشش نہیں ہوئی۔ سرِشام جب اجنبیت کا احساس روح کے لئے گھٹن کا سامان مہیا کرتا ہے تو میں دروازے کے پاس کھڑا ہو جاتا ہوں اور گلی کے آوارہ لڑکوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں دیکھتا ہوں۔ پھر واقعات کی یکسانیت اور تکرار سے تنگ آکر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھلی سڑک پر آجاتا ہوں جہاں زندگی کا ہنگامہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ بسوں کی اوورٹیکنگ، ٹریفک کا شور، لوگوں کی ریل پیل —— بس ایک افراتفری سی مچی ہے۔ اس شور شرابے میں اپنی حیثیت جھیل کی سطح پر جمی ہوئی کائی کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ زندگی کا مفہوم کچھ سمجھ میں آتا ہے تو قدموں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے!

بس اسٹاپ کے قریب ہی پان سگریٹ بیچنے والے کا ایک کیبن ہے۔ پنواڑی پان کی گلوریاں بنانے میں مصروف ہے۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ کاروباری مسکراہٹ کا سہارا لے کر شاطرانہ انداز میں کہتا ہے۔

"آیئے بابو جی، آج تو میں نے آپ کے لئے اسپیشل پان بنالیا ہے۔" میں پان کا عادی نہیں ہوں مگر اس کے تاجرانہ لب و لہجہ کے آگے انکار کی گنجائش کہاں باقی

رہتی ہے؟ اس انداز سے تو مجھے زہر بھی کھلایا جاسکتا ہے! پان کی جگالی ابھی جاری ہی رہتی ہے کہ اس کی زبان کی قینچی پھر چل پڑتی ہے۔

"دیکھ لیجئے بابوجی! آج میں نے آپ کی پسند کو خاص طور پر اپنی دکان میں سجایا ہے۔" وہ ریڈ اینڈ وہائٹ سگریٹ کے پیکٹوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "کل مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی جب آپ نے یہ سگریٹ طلب فرمایا تھا۔" وہ فی الفور ایک پیکٹ میری طرف بڑھا دیتا ہے۔ اس کی شائستگی اور کارگزاری کا مہذب انداز مجھے پسند ہے۔ شائد اس کا ماضی اچھی صحبت میں گزرا ہوگا۔ مگر میں اس سلسلے میں کوئی سوال اٹھانے سے گریز کرتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنے ماضی کی کتاب کا طویل باب میرے سامنے نہ کھول دے!!

شام کا وقت ہے۔ سیکنڈ شفٹ کے اسکولوں کی ابھی ابھی چھٹی ہوئی ہے۔ سڑک پر تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے۔ بس اسٹاپ پر طلباء و طالبات کا ہجوم ہے۔ کچھ چہروں پر تابندہ مستقبل کے دلنواز رنگوں کے عکس ہیں، کچھ کورس کی کتابوں کی کمیابی کا ذکر کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی میرے قریب سے تین لڑکے گزرے ہیں۔ ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں، سگریٹ اُن کی انگلیوں میں جل رہے تھے اور وہ ٹیلیفون کے پول کے پاس کھڑی ہوئی چند طالبات کو غیر شائستہ اشارے کر رہے تھے۔ ان کے جاتے ہی پان والا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"دیکھا بابوجی آپ نے ان لونڈوں کو! ابھی سے یہ حال ہے۔" وہ پان کے پتے پر چونا لگاتے ہوئے بولا۔ "اپنی قوم کا بیڑہ ہی غرق ہے۔" میں نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میری سوچ ایک بے نام سی سرحد میں داخل ہو گئی تھی۔ پھر مجھے وہ پاگل نظر آگیا جس کو میں گذشتہ کئی روز سے دیکھتا آرہا ہوں۔ اس کی حالت بے حد سقیم ہے۔ بدحالی نے اس کی صورت حد درجہ مسخ کر دی ہے۔ محض اس کی بے ربط باتیں اس کے وجود کا اثبات کرتی ہیں۔ کبھی وہ بہ آوازِ بلند غیر مربوط اور ناقابلِ فہم جملوں کی گردان کرنے لگتا ہے تو کبھی آسمان کی طرف سر اٹھا کر دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیتا ہے۔ پھر زور زور سے یوں قہقہے لگاتا ہے جیسے زندگی بھر کا سرمایہ لٹ جانے کا ماتم کر رہا ہو اور آنسو بوند بوند کر کے دل کی آنکھوں سے ٹپک رہے ہوں۔ جس جگہ اس کا گزر ہوتا ہے دنیا

والوں کے ہونٹوں کے ترکش سے بس بھرے قہقہوں کے تیر نکل کر فضا میں موسلا دھار بارش کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ میں اتنا متین اور سنجیدہ بھی نہیں ہوں مگر اس کے باوجود میرے قہقہے دل کے نہاں خانوں ہی میں دبکے رہتے ہیں۔ میں دیکھ تو نہ سکا مگر مجھے احساس ہوا کہ اظہارِ تاسف کے طور پر میرے چہرے نے مختلف رنگوں کی پرچھائیوں کو جنم دیا ہے جو چند لمحوں کے اندر آپس میں گڈمڈ ہو کر ایک درد بھری شبیہہ بن کر ابھریں۔

"بے چارہ!!"

"ہاں بابوجی! وقت نے اُسے بیچارہ بنا دیا ہے۔" پان والے کی آواز غم کی ردا اوڑھے ہوئے تھی۔ میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اس کا کاروباری انداز، اس کا کھلنڈرا پن سے اتھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے حیرت سی ہوئی۔ ایک معمولی انسان کی روح بھی اتنی حساس ہو سکتی ہے!!

"کیا یہ پیدائشی پاگل ہے؟"

"پیدائشی پاگل!!" اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔ "بابوجی! پاگل پیدا کہاں ہوتے ہیں۔ بنا دیئے جاتے ہیں۔" اس اثرانگیز جملے نے کسی حد تک مجھے مرعوب کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے فلسفۂ حیات پر کوئی مدلل اور جامع تقریر سن رہا ہوں۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ایک معمولی آدمی سے بھی بڑھیا چوکھی اور معنی خیز بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے!! اس سب میں جیسے میری دلچسپی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اُس کے چہرے کو دیکھا وہ اتھاہ گمبھیر سوچ کا گہوارہ بنا ہوا تھا اور پھر سگریٹ کا تلخ دھواں فضا میں بکھیر کر میں اس سے مخاطب ہوا۔

"کیا تمہیں اس کے متعلق کچھ اور معلوم ہے؟"

"کچھ!! مجھے بہت کچھ معلوم ہے بابوجی!" اُس نے پان کا ایک سڑا ہوا حصہ قینچی سے کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ میرا بچپن کا دوست ہے۔" وہ خاموش ہو گیا اور چپ چاپ چونے کتھے میں لگے ہوئے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ اس کا انداز اس کی اندرونی بے چینی کی چغلی کھا رہا تھا۔۔۔ شام کے بیمار اُجالوں پر تیزی سے اندھیروں کا آنچل پھیلتا جا رہا ہے۔ میرے کندھوں کو پیار سے

تھپتھپاتا ہوا ٹھنڈی ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا دوسری طرف نکل گیا جیسے رومانی جذبات کے گنگناتے چشمے کی کوئی موج ابھر کر ڈوب گئی ہو۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے پاگل دوست کو دیکھ رہا تھا جو کم عمر لڑکوں کے جھنڈ میں پھنسا ان کے عامیانہ مذاق کا ہدف بن رہا تھا۔ عین اسی لمحے بس اسٹاپ پر ایک خوبرو لڑکی کی جھب دکھائی دی تو لڑکوں کی توجہ اس طرف منعطف ہوگئی اور وہ حصار توڑ کر چیختا چلاتا ہوا ہاتھوں کو نچاتا ایک طرف بھاگ گیا۔

"بابو جی کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے" پنواڑی کی آواز جیسے کسی اندھے کنوئیں کے پاتال سے اُبھری۔ "خدا سو بدمعاش بیٹے دے مگر ایک شریف بیٹی نہ دے" فلسفہ بڑا ژولیدہ ہے۔ اس کو سلجھانے کی کوشش میں میرا ذہن الجھ گیا۔ اور جب ذہن کا سائیں سائیں کرتا ہوا سناٹا سڑک کے شور و غل سے ہم آہنگ ہوا تو میرا سر تیزی سے گھومتے ہوئے جھولے کی طرح چکرا گیا۔

"عورت! کیا اس کے پاگل پن کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہے؟"

"جی ہاں!" اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔

"کیا محبّت کا چکر؟" میری سوالیہ نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

"محبّت!!" وہ تیزابی ہنسی کی پھوار اُڑاتے ہوئے بولا" بھلا اس کا محبّت سے کیا واسطہ؟ مگر.... نہیں.... آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ محبّت ہی نے اس کا یہ حشر کیا مگر جس لڑکی کی محبّت میں وہ برباد ہوا وہ اس کی محبوبہ نہیں تھی۔ سگی بہن تھی!"

میں بُری طرح چونکا۔ اس امکان کے بارے میں تو میں نے تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ وہ عمارت جس کی بنیادیں نے چند موہوم خیالوں پر رکھی تھی، آنِ واحد میں زمین بوس ہوگئی۔ میری حالت اس کہانی کار سے جدا نہ تھی جس کی کہانی نے اُس کی مرضی کے خلاف ایک نیا اور حیرت انگیز موڑ اختیار کر لیا ہو! پان والے نے شاید میرے چہرے سے میری دلی کیفیات کا اندازہ کر لیا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میری آواز میں پوری کہانی معلوم کرنے کا بھرپور اشتیاق نمایاں تھا۔
"پھر...!" وہ ایک گھٹی گھٹی سانس لے کر بولا" پھر وہی ہوا بابو جی جو ایک غیرت مند

بھائی کے ساتھ ہوتا ہے ۔ یہ پاگل — جب یہ پاگل نہیں تھا تب بھی پگلوں کی طرح خوابوں کے سہارے دن بتایا کرتا تھا ۔ اسی جگہ بابو جی جہاں سے آپ اس کا تماشا دیکھ رہے ہیں — وہ سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے اپنے دل کی آرزو مجھ سے بیان کرتا تھا ۔ وہ بڑے دھوم دھڑکے سے اپنی بہن کی شادی کرنا چاہتا تھا ۔ محنت مزدوری اور خون پسینہ ایک کر کے وہ گھر والوں کا پیٹ پال رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بہن کو بھی تعلیم کے زیور سے سنوار رہا تھا اور بابو جی اس دن وہ کتنا خوش تھا جب اُس کی بہن نے دسویں جماعت پاس کر لی تھی ۔ وہ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا ۔ اس کے ہاتھ میں لڈو تھے صفرے نے میری حالت پتلی کر رکھی تھی ۔ طبیعت مالش کر رہی تھی ۔ سر چکرا رہا تھا مگر اُس کی خوشی کے لئے مجھے وہ لڈو کھانے ہی پڑے ۔"

"شبو ! اب میں اپنی بہن کی شادی کروں گا ۔ اب اس نے دسویں پاس کر لی ۔" وہ خوشی سے باؤلا ہو رہا تھا ۔ میں ڈر گیا بابو جی ! زیادہ خوشی بھی تو خطرناک ہوتی ہے نا ؟" اس کے چہرے کا رنگ دہکتے ہوئے تانبے کی مانند ہو گیا ۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا ۔ اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی سی دلدوزی تھی مگر اس کے اندر چھپی ہوئی سی کرختگی کو میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا ۔ اتنے میں دو چار آدمی دکان پر آ گئے ۔ دو ایک نے سگریٹ کا پیکیٹ خریدا ۔ ایک نے پان لے کر جگالی شروع کر دی ۔ وہ چلے گئے تو وہ کتھے کے کٹورے کو پرے ہٹاتے ہوئے یوں لب کشا ہوا ۔

" پھر چند ہفتوں بعد اس کی بہن کی منگنی ہو گئی اور میرے خیال میں وہ اسی وقت آدھا پاگل ہو گیا تھا ۔ مگر اس وقت اس کی وجہ خوشی کی زیادتی تھی ۔ اب ہمیشہ اس کا چہرہ ہنستا رہتا ۔ آنکھیں مسکراتی رہتیں ۔ مجھ سے ملتا تو باتیں کم کرتا اور ہنستا زیادہ ! خیر بابو جی کہانی تو بہت لمبی ہے ۔ مختصر یہ ہے کہ اُس کی بہن کی شادی نہ ہو سکی ۔"

"کیا ؟" میں بے اختیار چونک گیا ۔ جذباتی تلاطم کا احساس رگ و پے میں دوڑ گیا "مگر کیوں ؟"

"کیونکہ لڑکے والوں کو کوئی ایسا خاندان مل گیا تھا جو لڑکے کو زیادہ دام دے کر خرید رہا تھا اور میرا دوست — وہ تو قلاش تھا ۔"

"اوہ!!" مختلف النوع طوفانی احساسات کے قدموں تلے کچل کر میرے دل کی حالت اس کار کی مانند ہوگئی جو ایک ٹائم بم سے اڑا دی گئی ہو! نہ جانے یہ میرا واہمہ تھا یا حقیقت کہ میری نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک ڈراؤنا خلاء زہریلے دھوئیں سے لبریز میرے سامنے تھا۔ اور اسی دھوئیں کی چادر سے ٹکراتی ہوئی اس کی آواز ابھری۔

"اس دن شام ڈوبتے ہی وہ میری دکان پر آگیا۔ اور بابوجی اس کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس دن بھی وہ قہقہوں کے ڈھیر لگا رہا تھا۔ مگر اس کے قہقہے زندگی سے خالی تھے۔ اس کا چہرہ وحشت ناک تھا۔ وہ کڑوی آواز میں بولا۔

"شبّو! یہ بھی عجیب بات ہے بے غیرت امیر لڑکی کے لئے خوشی کے دو موقعے ہمیشہ یادگار ہوتے ہیں۔ ایک تو منگنی کا دن اور دوسرا منگنی ٹوٹنے کا دن! مگر غیرت مند لڑکی کے لئے دوسرا موقعہ موت ہوتا ہے۔ شبّو! میرے دوست! آج میری بہن مر گئی۔ شبّو... وہ قہقہے لگا رہا تھا، وہ آنسو بھی بہا رہا تھا۔ قہقہوں اور آنسوؤں کا یہ ملاپ بڑا عجیب تھا۔ بڑا خوفناک... بابوجی! میں سچ مچ ڈر گیا پھر وہ مجھے تین روز نظر نہ آیا۔ چوتھے دن میں نے اسے دیکھا تو کانپ گیا۔ شرارتی بچوں کے غول میں اس کا جسم پتھروں کا نشانہ بن رہا تھا اور وہ عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔"

کہانی ختم ہو چکی تھی مگر میرے ذہن میں ایک دوسری المیہ کہانی کے تار و پود یکجا ہو رہے تھے۔ میرا ذہن غم انگیز تاثرات کی گرد میں نہا چکا تھا۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں تو دیکھا کہ شبّو کی آنکھیں شدید روحانی اذیت کے بوجھ سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل کر ایک مستقل غم کے روح فرسا احساس کی چغلی کھا رہا تھا۔ اور پھر یکایک اس کی آنکھوں سے اشکوں کا فوارہ پھوٹ نکلا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"تمہیں کیا ہوا؟" میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"بابوجی میرے دوست کی طرح میں بھی ایک دن پاگل ہو جاؤں گا۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے رک رک کر بولا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ میں بھی ایک بہن کا بھائی ہوں" وہ آنسو بھری آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولا "اور میں نے بھی اپنی بہن کے متعلق رنگیں خواب دیکھے ہیں — یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کبھی پورے نہیں ہوں گے... بابو جی... میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر بہن کی گالی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی!!"

یہ انسانی الم کا نقطۂ عروج تھا۔ میرا ذہن عملی طور پر بیکار ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پاگل کا غم شبو کا غم ہو اور شبو کا غم میرا غم — اور میرا غم ہر حساس اور غیرت مند بھائی کا غم جو بہن کے متعلق طفلانہ مسرت سے ہمکنار کرتے والے خواب دیکھتا ہے اور ماہ و سال کی گردش ان زرنگار خوابوں کو تلخ حقیقتوں کے آغوش میں پہنچا دیتی ہے — میں گھر کی طرف لوٹنے لگا۔ میرا ذہن اندھیروں کی گود میں ہمک رہا تھا اور دل ایک ہمہ گیر الم سے معانقہ میں مصروف تھا۔ عین اسی لمحے میری نگاہوں کے سامنے صغرا کا چہرہ گھوم گیا... صغرا میری چھوٹی بہن — جو مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔ جس کے مستقبل کو کیف پرور اور تابندہ بنانے کے لئے میں ہمیشہ سے کوشاں ہوں۔ جس کے لمحوں کو روشن کرنے کے لئے میں کیا کیا سوچ رہا ہوں! تو کیا یہ صرف خواب ہے؟ پریوں کی کہانی؟ اور پھر جیسے خیالوں کے ہجوم نے میری نگاہوں کے سامنے ایک ہجوم کو لا کر کھڑا کر دیا۔ خوبصورت اور چمکتے ہوئے چہروں والی لڑکیوں کا مجمع.... حقیقت کے عفریت سے بے خبر، اپنے طرب انگیز خوابوں میں ڈوبی ہوئی لڑکیاں.... زمانہ قدیم کے دل آویز مجسموں کی طرح حسین دوشیزائیں.... اور جیسے میں ان کے سامنے اکیلا نہ تھا میرے قریب پریشان چہرے والے بے شمار نوجوان کھڑے تھے۔ نکبت و دلدر کے عبرت ناک مرقعے، آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے، اپنے وجود سے بھی گریزاں گریزاں .... جیسے افکار دق کے جراثیم بن کر انہیں چاٹ رہے ہوں۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا مگر اس کے باوجود سکوت کا عالم تھا۔ سناٹوں کا راج تھا جیسے ہر ایک نے اپنی آخری سانسیں پوری کر لی ہوں — اور پھر یکلخت اس طوفان خیز خاموشی کے خول میں درز سا پڑ گیا اور ایک بے حد مغلظ بہن کی گالی فضا میں یوں گونجی کہ میرے جسم کا رواں رواں لرز گیا۔ دوسرے نوجوانوں کی حالت مجھ سے مختلف نہ تھی۔ سب لرزہ براندام تھے — بہن کی گالی ہر دور، ہر زمانہ میں

دہرائی گئی۔ یہ ایک بہت پرانی گالی ہے مگر اس کے باوجود موت کی طرح ہمیشہ نئی لگتی ہے۔ اور اس وقت میں اس گندی گالی کی غلاظت میں خود کو سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا محسوس کر رہا تھا!!

کنیادان

گیتا کی جوانی بھیکاجی کے ناتواں کندھوں کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن گئی تھی۔ جب کبھی اس کی نظر گیتا کے چاند جیسے مکھڑے پر پڑ جاتی تو وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس کے ذہن پر ایک کاری ضرب لگتی اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تقریباً مفلوج ہو کر رہ جاتیں ــــ اس کو غم اس بات کا نہ تھا کہ گیتا جوان کیوں ہے؟ بلکہ شکایت اس چیز کی تھی کہ سندرتا بخشنے میں بھگوان کو اتنی فیاضی سے کام لینے کی کیا ضرورت تھی؟

گیتا کو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ اس کا بڑھتا ہوا حسن آفتابِ ازل کی کرن سے کم نہ تھا۔ اس کی اٹھتی ہوئی جوانی میں نہ معلوم کتنے قیامت خیز طوفان چھپے ہوئے بیٹھے تھے۔ جب وہ مستی سے بھرپور انداز میں چلتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے موسم گل بے خود ہو کر ناچنے لگا ہو! دیکھنے والا جب اس کے شاداب چہرے کے چکنے راستے کی پھسلاہٹوں سے اتر کر اس کے مرمریں جسم کے نشیب و فراز میں قدم جمانے کی کوشش کرتا تو اس کی حیثیت ایک سحر زدہ معمول کی طرح ہو کر رہ جاتی!

جب سے آوارہ نظریں اس کے گداز جسم کی جانب بھٹکنے لگی تھیں تب سے بھیکاجی چوکنا ہو گیا تھا۔ لوگوں پر بھروسہ کرنے کے دن رخصت ہو چکے تھے۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ گیتا کے دیویوں جیسے پوتر حسن کو لوٹنے نہ معلوم کتنے راون آس پاس بھونروں کی طرح منڈلانے لگے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسی کوئی بات ہو کہ جس کے سبب اس کی ناک کٹ کر لوگوں کے پیروں تلے روندی جائے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی عزت ہر قیمتی شے سے کہیں زیادہ قیمتی

ہوتی ہے۔ چنانچہ اب گیتا کو اکیلا چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اب وہ ایک طرح سے اس کی ہمزاد ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ دل کی طرح اس کو اپنے ساتھ رکھنے لگا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ وہ گیتا کو تنہا گھر پر بٹھا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کا پڑوسی راجو عاشق مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ اوباشی اور بدمعاشی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ آوارگی اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عورتوں کے آگے پیچھے گھومنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے قریب گیتا کو چھوڑنا ایسا ہی تھا جیسے شیر کے سامنے بکری کو لاکر کھڑا کر دیا جائے۔ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ گیتا کو ساتھ لئے وہ راستوں کی خاک چھانتا پھرے! بیٹی کی عزت بچانے کی خاطر وہ ساری دنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ ہر آنے جانے والے کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ اگر کوئی کام سے بھی اس کے پاس آتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہو۔ اتنی کڑی نگرانی کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔ اس کے خیال میں مزید کچھ کرنے کی ضرورت تھی!

بھیکاجی کی بسر اوقات بھیک پر تھی۔ یہ اس کا موروثی پیشہ تھا۔ چونکہ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ماتا پتا کو بھیک مانگتے دیکھا تھا اور انہیں کی زیر تربیت بھیک مانگنے کے سارے گُر سیکھتا رہا تھا اس لئے اب وہ اس فن میں ایسا گرگ باراں دیدہ ہو گیا تھا کہ ضعیف العمر اور جہاں دیدہ بھکاری بھی اس کو اپنا گرو تسلیم کرتے تھے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ کن تلوں میں کتنا تیل ہوتا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے سامنے مختلف طریقوں کو اس ہنرمندی سے استعمال کرتا کہ شقی القلب افراد بھی اس کو کچھ نہ کچھ دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس کے چہرے پر نکبت، مفلوک الحالی اور بیچارگی کے آثار یوں ہویدا ہو جاتے کہ حساس دلوں میں بے اختیار رحم اور ہمدردی کی جوت جل اُٹھتی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے سامنے والے کا ہاتھ بلا جھجک جیب کی جانب آپ ہی آپ سرک جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہم عصر اور ہم پیشہ لوگوں میں سب سے زیادہ بھیک حاصل کرتا تھا۔ ہفتہ بھر کی تذلیل اور محنتِ شاقہ اور ٹھوکروں کے بعد جتنی رقم اس کے ساتھی حاصل کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ وہ دو چار روز کے اندر اپنی اداکارانہ مہارت کے ذریعہ پیدا کر لیتا تھا۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ دوسروں کے برعکس وہ اس قابل تھا کہ ہفتہ میں دو ایک روز گھر میں بیٹھ کر ہی جسمانی اور ذہنی تھکن کو باآسانی فرو کر سکتا یا مختلف النوع تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لے کر خود کو دنیاوی فکروں سے بے نیاز کر دیتا۔ اس کے برعکس دوسرے بھکاریوں کی حالت اس سے یکسر مختلف تھی۔ اگر وہ چند گھنٹے بھی ڈیوٹی پر نہ جاتے تو ان کی روٹی سوکھی ہی رہتی۔ اس پر دال کا ایک قطرہ بھی نہ پڑتا تھا۔

جس شہر میں وہ رہتا تھا اس کی آبادی دوسرے شہروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ اور پھر وہی ملک کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی تھا۔ یہاں تجارتی زندگی کا بازار گرم رہتا تھا۔ لین دین اور خرید و فروخت اعلیٰ پیمانے پر ہوتی تھی۔ ملک کے دور دراز علاقوں سے تاجر اپنا سامان لاکر اس کی منڈیوں میں بیچا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فراخدلی سے بھیک دینے میں کسی کو تاسف کا احساس نہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنی رقم آجاتی بھیکاجی کے حوالے کر دیتے تھے۔ ان کے ذہن تو تجارتی مسائل کے تار و پود سلجھانے میں منہمک رہتے تھے۔ بھلا انہیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ ریزگاری گننے بیٹھ جاتے۔

بھیکاجی یہاں کے چپّے چپّے سے واقف تھا اس کا تجربہ دیرینہ تھا۔ اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ کون کتنا دریادل ہے اور کون کتنا کنجوس ہے! دن رات گلی کوچوں میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے لوگوں کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ انسانی نفسیات کا ماہر ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ آدمی کے ماتھے کو دیکھ کر، اس کی آنکھوں میں جھانک کر ہی معلوم کر لیتا تھا کہ ان تلوں میں کتنا تیل ہے۔ یہاں دال گلنی آسان ہے یا نہیں!۔

اس کے دن آرام سے کٹ رہے تھے۔ غمِ روزگار اس سے کوسوں دور تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دوسرے بھکاری اس کی خوشحالی اور فارغ البالی کو دیکھ دیکھ کر ببول کا کانٹا بنتے جارہے تھے۔ لیکن جیسے ہی گیتا کی مقناطیسی جوانی نے اپنے اطراف اجنبی مداحین کے جمِ غفیر کو یکجا کرنا شروع کر دیا تو بھیکاجی کو محسوس ہوا جیسے فراغت اور بے فکری کا دور اس کے لئے گذرا ہوا رنگین سپنا بن گیا ہو! فکروں نے دیمک بن کر اس کے ذہن کو چاٹنا شروع کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا آخر وہ کب تک گیتا کی جوانی کا پہرہ دار بنا بیٹھا رہے گا! یہ گمبھیر مسئلہ کا پائیدار حل تو نہ

تھا ــــ اور پھر دن رات کے سوچ بچار اور مغز سوزی کے بعد روشنی کی ایک ہلکی سی کرن اس کے ذہن کے اندھیاروں میں ابھری۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ گیتا کا بیاہ ہی ان سارے مسائل کو حل کرسکتا ہے۔ گیتا کو یقیناً ایک پتی کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا مستقل اور قابل اعتماد نگہبان جو زندگی بھر اس کی خاطر خواہ حفاظت کر سکے۔ جو اس کی کومل جوانی کو ہوس پرستوں کی عامیانہ نگاہوں سے دور رکھ سکے۔ اور پھر یہ بات ظاہر تھی کہ بیاہ کے بعد دنیا والے اسے مجبور اور بے سہارا سمجھ کر اس کی جوانی سے کھیلنے کی کوشش نہ کر سکتے۔

بھیکا جی کو یقین ہو گیا کہ گیتا کا بیاہ ہی اس کے سارے دکھوں کا تیر بہدف علاج ہے مگر سوال یہ تھا کہ اتنی خوب صورت، اتنی خوب سیرت لڑکی کے لئے وہ اچھا سا پتی کہاں سے ڈھونڈ کر نکالے؟ ایسے ویسے للو پنجو اور چور اُچکے قسم کے نوجوان تو اسے ہر راستے کے موڑ پر بآسانی مل سکتے تھے۔ مگر بھیکا جی تو ایسوں کے سائے سے بھی کتراتا تھا۔ اس کو ہنوز اپنی پتنی کے وہ آخری الفاظ ازبر تھے جو اس نے مرنے سے کچھ دیر قبل اس سے کہے تھے۔

”بھیکا جی! میں جانتی ہوں کہ ہم بھکاری ہیں۔ اس لئے گیتا کا بیاہ بھی اپنی برادری میں ہوگا مگر بھگوان کے لئے اس کے لئے ایسا پتی تلاش کرنا جو اچھی خوبیوں کا مالک ہو۔ جو اس کو سُکھ چین دے سکے۔“

اور اتنی مدت بیت جانے کے باوجود اس کو اپنی پتنی سے کیا ہوا عہد یاد تھا اس نے قسم کھائی تھی کہ اگر وہ زندہ رہا تو ہر حال میں اس وعدہ کو پورا کر کے دم لے گا!

ہر سال کی طرح اس سال بھی سردیوں کے آغاز میں شہر کے دور افتادہ حصے میں شمبھو دیوتا کے مندر کے اطراف و اکناف میں ایک شاندار میلہ منعقد ہوا۔ اس علاقے کا نام دیوتا پور تھا۔ اور وہاں کے لوگ اس میلہ کو شمبھو یاترا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس کی زیارت کے لئے ملک کے دور دراز علاقوں سے شائقین، معتقدین اور تماشبینوں کا جم غفیر جمع ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر لوگ اپنے دلوں میں تمناؤں کا انبوہ لئے یاترا کو آتے تھے۔

مندر کی خوب صورت عمارت پہاڑی کی ایک بلند و بالا چوٹی پر واقع تھی جس کے اندر

شمبھو دیوتا کی وشال مورتی بھرپور تقدس کے ساتھ کھڑی صدیوں سے دکھی دلوں کو جاوداں مسرت کا پیغام دے رہی تھی۔ لوگ مورتی کے چرنوں میں سیوتی کے سفید پھولوں کی بارش کرتے تھے تاکہ ان کی دلی مرادیں برآئیں۔

میلے کے دوران ہر ایک کے لبوں پر سچّی مسکراہٹیں کھلا کرتیں۔ ذہن ہر قسم کی فکر سے آزاد ہوتے۔ اور دلوں کی سرزمین پر خوشی پھول بن کر مہکنے لگتی۔ مالی اعتبار سے بھی لوگوں کے لئے یہ یاترا منفعت بخش ثابت ہوتی۔ ان چند دنوں میں اکثر تاجروں کو اتنا منافع ہوتا کہ وہ سال بھر معاشی تفکرات سے کلی طور پر آزاد ہو جاتے۔

شمبھو دیوتا کا ابر کرم بھکاریوں کے دلوں پر بھی ٹوٹ کر برستا۔ ان کی بیکراں سعادت سے وہ بھی محروم نہیں ہوتے۔ ان کا ہر لمحہ سونا بن کر چمکنے لگتا۔ اُن کو اتنی بھیک ملتی کہ بیشتر بھکاریوں کو کوتاہی داماں کی شکایت ہو جاتی، علاوہ ازیں سیلانی قسم کے لوگوں کے لئے سیر و تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لئے وافر مواقع تھے۔ وہ زندگی کی یک رنگی اور یکسانیت سے اُکتا کر اس طرف نکل آتے اور گوناگوں تفریحی ہنگاموں میں کھو کر دنیاوی فکروں سے بے خبر ہو جاتے۔ میلے کے دوران ہر ایک شادماں و مسرور رہتا۔ وقت کی بھیرویں پر زندگی بے خود ہو کر رقصاں ہو جاتی۔ بھجنوں کے مدھر بول کانوں میں رس گھولا کرتے اور مندر کی گھنٹیاں سن کر دلوں کو آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوتا۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی بھیکا جی میلے میں آیا تھا۔ مگر اس مرتبہ اس کا مقصد بھیک مانگنا نہ تھا۔ اس کی حیثیت ایک ایسے پاکباز یاتری کی طرح تھی جس کے من مندر میں آرزو کا ایک چھوٹا سا دیا روشن ہوا اس کا من شمبھو دیوتا کی درشن کے لئے بے چین تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ مندر کی ہر سیڑھی پر بوسہ دیتا ہوا دیوتا کے چرنوں میں حاضری دے گا۔ وہ اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیات سے دیوتا کو آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک گیتا کی جوانی کو گندے عناصر سے بچانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ اس کے خیال میں یہی ایک ایسی قسم تھی جس کے پورا کرنے سے گیتا کو ایک سندر اور خوب سیرت پتی مل سکتا تھا۔

اپنی قسم کو جب وہ پوری کر کے اپنے خیمہ میں پہنچا تو اس کے بدن کا ہر حصہ تھکن سے چور چور

تھا۔ اس کی حالت ایک ایسے سپاہی سے کم نہ تھی جو میدانِ جنگ سے بُری طرح زخمی ہو کر واپس لوٹا ہو۔ سیڑھیوں پر بوسے دیتے دیتے اس کے ہونٹوں پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔ جھکتے جھکتے اس کی کمر میں ناقابلِ بیان درد ہو رہا تھا ــــ اس رات وہ مُردے کی طرح سوتا رہا۔ سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو حیرت انگیز طور پر تر و تازہ پایا۔ اگرچہ جسم ابھی تک ایک پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ مگر ذہنی طور پر وہ ساری دنیاوی تفکرات سے خود کو بے نیاز محسوس کر رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں بار بار اس کا جی زور زور سے ہنسنے کو چاہ رہا تھا۔ دل پر ایک سرور آگیں ترنگ سی چھا رہی تھی۔ اور اس کی آتما طمانیت اور بالیدگی کے احساس سے ہم آغوش تھی۔

گیتا نے اس کے لئے گرم گرم چائے تیار کی۔ چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ اس بے نام خوشی کی کیفیت نقطۂ عروج کی سمت بڑھتی گئی۔ چائے کی حرارت نے اس کی جذباتی حرارت کو فزوں کر دیا تھا۔

چائے پیتے ہوئے اس کی نظر خیمہ سے باہر نکل گئی۔ اس نے کچھ دور ایک تنومند اور خوبرو نوجوان کو ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑے دیکھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ بائیس تیئس سال کا ہو گا۔ اس کے صبیح چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھوں نے ایک عجیب سی نستعلیق شان پیدا کر دی تھی۔ وہ مردانگی اور حسن کا اعلیٰ ترین نمونہ بن کر بھیکا جی کے سامنے کھڑا تھا۔

"کتنا خوب صورت نوجوان ہے!" بھیکا جی نے دل میں سوچا "لیکن یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور یہاں کیوں کھڑا ہے؟" ایسے مختلف النوع سوالات ہجوم کی شکل میں اس کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ بھیکا جی نے اس سے قبل اس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اچانک اس نوجوان کے باب میں اس کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔

"گیتا! یہ کون نوجوان ہے؟" اس کے پوچھنے پر گیتا کے چہرے پر گلابی رنگ یوں بکھر گیا جیسے کسی نے وہاں گلال مل دیا ہو۔ اس کی گردن میں ہلکا سا خم آگیا تھا۔

"یہ ....." وہ دبے الفاظ میں بولی ــــ "یہ تورا مو بھیا کے چھوٹے بھائی ہیں جن کے حصے میں بھیکا رو کا علاقہ ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جب بھیکا جی میونسپل پبلک نل کے پاس بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا تو اس وقت بھی اس کے ذہن پر اس خوبرو نوجوان کا تصوّر حاوی تھا۔ وہ یوں اچانک اس کے خیالات میں در آیا تھا جیسے اس کے وجود کا جزو لاینفک ہو۔

"اگر میری گیتا کا بیاہ اس کے سنگ ہو جائے تو دونوں کی کیا شاندار جوڑی ہوگی!" اس نے سوچا دنیا والے جل جل کر کوئلہ ہو جائیں گے۔ بھیکا جی یکبارگی اطراف کے ہنگاموں سے کٹ کر سپنوں کی رنگ بھری دنیا میں کھو گیا۔ گیتا کے بیاہ کے سلسلے میں جو سپنے وہ رات کے اندھیرے میں دیکھا کرتا تھا، وہ دن کے اجالے میں اس کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"کیا شمبھو دیوتا نے میری پرارتھنا سُن لی ہے؟ کیا انہیں میری حالت پر رحم آگیا ہے؟" اس کا ذہن مختلف سوالات کی آماجگاہ بن گیا ـــــ اور تب یکایک اس کا چہرہ جذبات کی تمازت سے تمتمانے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کی مصیبت اور پریشانی کے دن رخصت ہو گئے ہوں۔ جیسے زندگی کی انمول خوشیوں نے بڑھ کر اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا ہو ـــــ اور اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج ہی رات وہ رامو بھیّا سے اس سلسلے میں گفتگو کرے گا۔

سارے بھکاری برگد کے بوڑھے درخت کی جوان اور پرسکون چھاؤں میں جمع ہو چکے تھے۔ قریب ہی تین بڑے پتھروں کی مدد سے ایک چولہا بنا دیا گیا تھا جس پر اس وقت ایک بڑی سی دیگچی میں چائے کا پانی مچلتے ہوئے جذبات کی طرح کھول رہا تھا۔ حقّے کی نلی باری باری سب کے ہونٹوں کو چوم رہی تھی۔ دھوئیں کے مرغولے بادل کی شکل میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ اور وہ سب گیتا اور رامو بھیّا کے چھوٹے بھائی شامو کی بیاہ کی بات کر رہے تھے۔

ماحول بڑا سنجیدہ تھا۔ شاید اس لئے کہ اس وقت دو زندگیوں کے مستقبل کا مسئلہ زیرِ گفتگو تھا۔ عمر رسیدہ بھکاری ان زیرک اور آزمودہ کار سیاست دانوں کی طرح متین تھے جن کے سامنے بین الاقوامی نوعیت کا حامل کوئی اہم ترین مسئلہ اچانک سامنے آگیا ہو! بھیکا جی ان کے درمیان خاموش بیٹھا آنے والے واقعات کے متعلق غور کر رہا تھا۔ اسی دوران اسے شامو

کے متعلق کچھ اور باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ اسے پتہ چلا تھا کہ شامو آجکل کے بے راہ رو اور گمراہ نوجوانوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ نیک، شریف النفس اور بلند کردار کا حامل ہوتے ہوئے بُری عادتوں سے کوسوں دور تھا۔ شراب نوشی اور جوئے سے اسے بے حد نفرت تھی لڑکیوں کے پیچھے وہ بھاگنے کا عادی نہ تھا۔ بزرگوں کا احترام کرنا وہ فرض اولین سمجھتا تھا۔ بالفاظِ دیگر وہ ہر کا ایسا باعزت بھکاری تھا جس کا دامن ہر قسم کی برائی سے پاک تھا۔

"بہتر ہے آج ہی ساری باتیں طے ہو جائیں ـــ" حقّے کا ایک طویل کش لے کر ایک تجربہ کار بوڑھے بھکاری نے کہا! "رامو کو اس بیاہ پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن...." وہ بات کرتے کرتے اچانک رُک گیا۔ اور جیسے بھیکا جی کا دل بھی دھڑکتے دھڑکتے رُک گیا ہو! اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے وہ بے چین سا ہو گیا۔ اس نے نظر اُٹھا کر بوڑھے کو دیکھا۔ وہ بھی بھیکا جی ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے بدلتے ہوئے تیور نے بھیکا جی کو متوحش کر دیا۔

"لیکن کیا؟" اس نے محسوس کیا جیسے آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی ہو۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ تم گیتا کو جہیز میں کیا دو گے ـــ" بوڑھے نے تیز نگاہوں سے بھیکا جی کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ اس کے لبوں پر کاروباری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

ایک لمحہ کے لئے سکوت کی چادر پھیل گئی۔ چاروں طرف سناٹا محیط ہو گیا۔ بھیکا جی کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ اس کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ بھرے مجمع میں ننگا کھڑا ہو!

"میں ایک غریب بھکاری ہوں" بھیکا جی نے دھیمے اور شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ تم ہی کہو میں جہیز میں کیا دے سکتا ہوں؟"

"دیکھو! بھیکا جی ـــ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ شامو جیسے نوجوان درختوں پر اُگا نہیں کرتے۔ وہ ایک ہیرے سے کم نہیں" اس کے قریب بیٹھے ایک اور دقیانوسی بوڑھے نے باآوازِ بلند کہا۔

"اگر تم نے شامو کو کھو دیا تو زندگی بھر پچھتاؤ گے" پہلے بوڑھے نے خالص تاجرانہ

لہجے میں کہا۔

"مجھے اس سے انکار نہیں۔میں دل و جان سے شامو کو اپنا داماد بنانا چاہتا ہوں۔ مگر جہیز —— تم ہی کہو نا کہ میں کیا دے سکتا ہوں"۔ پریشانی اور الجھن نے اس کے چہرے کو شرابور کر دیا۔اس کی گردن جھک گئی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ جوان بیٹی کا باپ ہونا کتنا مشکل کام ہے برسوں کی عزت خاک میں مل کر رہ گئی تھی۔اس نے گھبرا کر چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔اگرچہ ناک ابھی تک اپنی جگہ پر موجود تھی' مگر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کٹ کر رہ گئی ہو۔اس سے جلنے والے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"دیکھو بیاہ ابھی بھی ہو سکتا ہے اگر تم ۔۔۔"شاطر بوڑھے نے ایک اور مہرہ آگے بڑھا دیا۔

"کہو نا ۔۔۔ رک کیوں گئے"۔بھیکا جی نے پُر امید نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"اگر تم اصلی بازار میں بھیک مانگنا چھوڑ دو ——"بوڑھے نے تجربہ کار نگاہوں کو گھماتے ہوئے کہا"۔ دیکھو آج کل کے حالات میں یہ جہیز بہت ہی کم ہے"۔

بھیکا جی سناٹے میں آگیا۔یہ جہیز تو بہت ہی زیادہ تھا۔اصلی بازار سے بھیک میں اُس کو جو کچھ ملتا تھا، وہ اس کی نصف سے زیادہ آمدنی سے کسی طرح کم نہ تھا! اگر وہ اس آمدنی سے ہاتھ دھو بیٹھا تو اس کا کیا حال ہو گا؟۔اس صورت میں تو اس کی معاشی بے فکری کے سارے سہانے سپنے چکنا چور ہو جائیں گے۔

وہ سب اس کے جواب کے منتظر تھے۔نگاہوں کی برچھیاں اس کے جسم کے ہر حصے کو چھلنی کر رہی تھیں —— اور اس لمحے اچانک گیتا کے مستقبل کا خیال ایک کوندا بن کر اس کے ذہن میں لپکا۔اس نے سوچا کیا گیتا کے سکھ، اس کے رنگین جیون کے لئے کوئی بھی سودا مہنگا ہو سکتا ہے؟!!اصلی بازار جیسے پُر رونق علاقہ کا ملنا اس کے لئے جتنا مشکل تھا اس سے کہیں زیادہ مشکل شامو جیسے داماد کا ملنا تھا۔اس نے محسوس کیا شامو ایک ایسی بازی ہے جس کو جیتنے کے لئے سب کچھ داؤ پر لگایا جا سکتا ہے۔

مجھے منظور ہے!"بھیکا جی نے کمزور آواز میں کہا۔اس کا سر ابھی تک جھکا ہوا تھا اور اس کی حیثیت اس جواری سے مختلف نہ تھی جو اپنی بہترین بازی جیت کر بھی مطمئن نہ تھا۔

تصویر کے زخم

اُس رات غم اس کے ساتھ شب باش ہوا! لطیف و نازک حسیات کٹے ہوئے سانپ کی طرح تڑپتے رہے۔ دل کی حالت سیمابی تھی اور دماغ ایک ایسا اسٹیشن بن گیا تھا جہاں ہر چند لمحوں بعد برقی ٹرین دندناتی، شور مچاتی ہوئی تیز رفتاری سے گزر جاتی ہے۔

یکایک اس کے تصور میں وہ لمحہ زندہ ہو گیا جب پہلی مرتبہ اس نے حجاب کو دیکھا تھا۔

وہ یوں چپ چاپ دروازے کے پاس سر جھکائے کھڑی تھی جیسے ساری زندگی میں اُسے آرام و سکون کا کوئی گریز پا لمحہ میسر نہ آسکا تھا۔ اس کی جھکی جھکی گھنیری پلکوں پر میر کی غزلوں کا غم مصروفِ ماتم تھا۔ گھنے گھنے سیاہ بالوں کے درمیان مانگ کو دیکھ کر معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی صانع کے حسن کارانہ ہاتھوں کی معجز نما صلاحیتوں نے جبیں تک ایک آبجو نکالی ہو۔ عاصم کا ذہن خیالات کا مرجع بن گیا تھا۔

"یہ کیسی ماں ہے جس کی عمر اپنے بیٹے سے بھی چھوٹی ہے" اُس نے اپنے ذہن میں سوچا تھا۔ ایسے جان جوان بیٹے کی ماں کے جسم کو تو جوانی کا عبرت ناک کھنڈر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس تھا۔ اُس کے مرمریں ہاتھ! جیسے شاخِ گل، شاخِ صندل۔ اس کا صندلیں جسم! جیسے اُس کے روبرو یونان کے کھیتوں میں زیتون کی کاشت کرنے والی کوئی حسینہ کھڑی تھی۔ وہ غصہ، تلخی اور بیقراری کے ملے جُلے احساس کو ہم رکاب لئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر اُس کو پہاڑ جیسی حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ گھر سے چلا تھا تو کمرے

کی حالت ردّی کی دُکان سے مختلف نہ تھی مگر اب تو اس کی خوبصورتی کے نقوش جاودان ہو کر در و دیوار کے سینوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ فرش چمک رہا تھا اور کمرے کا ہر کونہ جمالیاتی احساس کی آسودگی کا سبب بن رہا تھا۔ دیواروں پر منقّش چوکھٹوں میں مُوقلم سے بنی ہوئی چند تصویریں نظر آئیں اور پھر اچانک ہی ایک تصویر پر اُس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ ایک بھولی بھالی لڑکی ایک خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ درخت کے سوکھے ہوئے تنے پر اپنا ایک ہاتھ رکھے دور خلاء میں گھور رہی تھی۔ درخت کے چُر مُرائے ہوئے سوکھے پتّے اس کے قدموں میں بکھرے ہوئے تھے اور ماحول میں اداسی کا زہر پھیلا ہوا تھا۔ مصوّر نے بڑی ہی ماہرانہ چابکدستی کے ساتھ لڑکی کی آنکھوں میں حقیقی کرب کے زندہ احساسات کو تمام تر جزئیات کے ساتھ نمایاں کر دیا تھا۔ نیچے لکھا تھا۔ "بہار آئے نہ آئے"

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے" خاموشی کی بُنیاد ایک مترنّم آواز کی نازک سی ٹھوکر سے متزلزل ہو گئی۔

وہ آہستہ سے پلٹا مسہری کے قریب رکھے ہوئے راؤنڈ ٹیبل پر ایک جاذبِ نظر ٹرے میں چائے کا سارا سامان نفاست سے رکھا ہوا تھا۔ عاصم نے دیکھا۔ وہ اپنی جھکی جھکی پلکوں میں پیغمبرانہ عظمت لئے خاموش کھڑی تھی۔ اس وقت بھی اس کی گردن خمیدہ تھی اور عاصم زمانہ کے اس عظیم المرتبت شہنشاہ کی بابت سوچنے لگا جس کی تمنّا تھی کہ وہ مرتے وقت بھی نہ جھکے۔ مگر ہم کتنی جلدی تقدیر کے آگے اپنا سر جھکا دیتے ہیں!!

"اوہ! اس کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔" عاصم کو خود اپنا لہجہ اجنبی سا محسوس ہوا۔

"چائے اور غسل سفر کی تھکن کو دُور کرنے کا تیر بہدف علاج ہیں" وہ سپاٹ آواز میں بولی "چائے پیجیئے، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد نہانے کا پانی بھی گرم ہو جائے گا۔" وہ جانے کے لئے جوں ہی بڑھی عاصم کی آواز نے اس کے بڑھتے قدموں میں زنجیر ڈال دی۔

"یہ تصویر ــــــ یہ زندگی کے تاریک پہلو کی لاجواب عکاس ہے۔" اس کی نظریں اٹھیں۔ وہ اُسی کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ایک لمحہ کے لئے چار ہوئیں۔

اور عاصم نے محسوس کیا جیسے اس لمحے نے زماں و مکاں کے سلسلے سے کٹ کر ایک بالکل ہی جُدا کائنات کی بنیاد ڈال دی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آتش دان کی تمازت تھی۔ ایک ایسی حدت جو عاصم کے تمام تر وجود کو بڑی آسانی کے ساتھ پگھلا سکتی تھی۔

"آپ کو تصویر پسند آئی؟"

"بہت زیادہ" وہ بولا۔"تب ہی تو اس کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا ہوں —— مگر یہ کس کے دستِ پُرکار کی جنبشوں کی مرہونِ منت ہے؟"

"یہ —— یہ میری ہی مبتدیانہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔" ایک لحظہ کے لئے اُس کے یاقوتی لبوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ اُبھری۔

"خوب —— تو آپ کو فنِ مصوری سے مس ہے" عاصم نے بڑھ کر ٹی کوزی اٹھالی دھوئیں کی چند باریک لکیریں ٹی پاٹ کی ٹونٹی سے نکل کر ادھر اُدھر منتشر ہوگئیں۔

"بس آڑی ترچھی لکیریں کھینچ لیتی ہوں۔"

"مگر ان آڑی ترچھی لکیروں میں آپ دُکھی جیون کے مضطرب جذبات کو خوب سموتی ہیں۔" اس کی بات پر وہ کچھ بے چین سی ہوگئی۔ عاصم نے ملازم کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس نے ایک اور پیالی لانے کا حکم دیا۔

"دوسری پیالی کی کیا ضرورت؟"

"بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اکیلے چائے پینے میں فرسٹریشن محسوس ہوتی ہے" وہ مسکرایا۔"اتفاق سے میں اُن میں سے ایک ہوں۔"

چائے پینے کے دوران وہ جھیل کے پانی کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ عاصم غور سے اس کے سُرخ حنائی ہاتھوں کو دیکھنے لگا —— اچانک اس نے محسوس کیا جیسے اُس کی دونوں ہتھیلیوں میں آگ لگ گئی ہو۔ مگر اس آگ میں گرمی نہ تھی۔ حدت نہ تھی۔ شاید یہ برف کی آگ تھی۔ جس کے برفانی شعلوں میں اس کے سارے جذبات یخ بستہ ہو کر موت کی ٹھنڈک سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر چائے کی پیالی ایک طرف رکھ دی۔ جب وہ چلی گئی تو یکایک کسی طرف سے ایک نامعلوم خیال نے خطرناک سانپ کی طرح سر

اٹھایا اور بل میں دبک گیا۔ وہ لرزہ براندام ہو کر رہ گیا۔

عرصۂ دراز تک خون تھوکتے رہنے کے بعد سردیوں کی ایک اُداس سہ پہر کو سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے جب عاصم کی ماں نے دُنیا پر ڈوبتی ہوئی آخری نظر ڈال کر آخری ہچکی لی تو اُس وقت عاصم کی عمر انجانے کھیل رچانے میں مصروف تھی۔ ہنوز اس کے شعور میں قوتِ میزہ نے جنم نہ لیا تھا۔ اُس کے برعکس اس کی ماں کی موت نے اس کے باپ کی کمر توڑ دی تھی اور وقت سے پہلے ان کی عمر نے زندگی کی سہ پہر کی شکل اختیار کر لی تھی مگر ایک ہی شے کے کھونے کا غم کب تک؟ لمحات کا تسلسل درد کے ساتھ دوا بھی دیتا ہے ــــ کچھ عرصہ بعد وہ بھی آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے لگے۔ ان کی اس واپسی کو یار دوستوں نے نیک شگون سے تعبیر کیا۔ خیر خواہوں نے خوشی منائی۔ پیسہ افراط سے تھا۔ دولت گھر کی لونڈی تھی۔ چند مخلص رشتہ داروں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا جسے انہوں نے فی الفور سختی سے رد کر دیا اور اپنی ساری توجہ عاصم کی پرورش پر صرف کر دی۔

اب عاصم بھرپور جوانی کا زندہ نمونہ تھا۔ اُسے اپنے والد سے بے پایاں محبت تھی۔ اس کے نزدیک وہ گوہرِ یک دانہ تھے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ بچپن کے جس راستے سے گزر کر جوانی کی منزل پر پہنچا ہے اس میں قدم قدم پر اُس کے والد نے یادگار اور ناقابلِ قیاس قربانیاں دی ہیں۔ مگر ایک دن اس کے والد کی محبت و عقیدت کی مضبوط اور مہتم بالشان عمارت خزاں رسیدہ کھوکھلے درخت کی طرح زمین بوس ہو کر رہ گئی۔ اُسے پتہ چلا کہ اُس کے والد دوسری شادی کر رہے ہیں۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا؟ اس عمر میں شادی تو دُنیا والوں کے لئے بِن پیسوں کے تماشے سے کم نہ ہوتی۔ وہ انہیں ان کی عمر کا واسطہ دے کر اس شادی سے باز رکھنا چاہتا تھا مگر جب اُس نے دیکھا کہ وہ کسی طور اپنے ارادے کو بدلنے پر تیار نہیں تو اُس نے یکطرفہ طور پر اس شادی کا بائیکاٹ کر دیا۔ اور شادی سے چند روز پیشتر پہاڑوں سے ڈھکی چھپی ایک خوبصورت سی وادی میں پہنچ گیا جس کے نشاط آفریں مناظر زندگی کے کسی بھی غم کا مداوا بن سکتے تھے مگر عاصم نے محسوس کیا کہ اس کی تلخیاں ہنوز جسم و ذہن کے خفتہ گوشوں میں بیدار تھیں۔

نہ جانے اُس کی عدم موجودگی میں کیا کیا واقعات ظہور پذیر ہوئے کن کن ہنگاموں نے جنم لیا جب وہ لوٹا تو والد صاحب کی شادی کو دو ہفتے سے زائد گزر چکے تھے۔ اور اُسے قطعی علم نہ تھا کہ ایک بپھرا ہوا طوفان اس کی آمد کا شدومد سے منتظر ہے۔ اُس نے سوتیلی ماں کو دیکھا تو چکرا گیا۔ دھوئیں کے بادل اٹھے اور اس کی روح گھٹ کر رہ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے والد ایک معصوم دوشیزہ کے ارمانوں کے خون سے اپنے جذبات کے پودے کی آبیاری کریں گے ـــــــ اس رات غم اس کے ساتھ شب باش ہوا۔ سفر کی بے انتہا تھکان کے باوجود نیند اُس سے کوسوں دُور تھی اور ذہن ژولیدہ خیالوں کے اُلجھے ہوئے بستر پر کٹے ہوئے سانپ کی طرح تڑپ رہا تھا!!

برآمدے کے آخری کونے پر پہنچ کر وہ ٹھٹھک گیا۔

اُس کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں ٹھوکریں کھاتی ہوئی ایک لمحے کے لئے دریچے کے کھلے ہوئے شفاف شیشوں سے ٹکرائیں اور پھر زقندیں بھرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ ٹھٹھک گیا۔ اُس کی دلچسپی اور تجسّس نے فزوں ہونے کا اعلان کیا تو وہ ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ کمرے کے وسط میں بیش قیمت ایرانی قالین پر شیشے کے چھوٹے سے خوشنما اسٹول کے قریب ایزل پر حجاب ایک ہاتھ میں برش اور دوسرے میں رنگوں کی پلیٹ لئے نستعلیق انداز میں جھکی ہوئی تھی ـــــــ تہذیب کے سارے اصولوں سے واقفیت کے باوجود عاصم خود کو نہ روک سکا اور بے محابا کمرے میں داخل ہو گیا۔ حجاب کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ وہ عاصم کی موجودگی کو مطلق محسوس نہ کر سکی اور گمبھیر خیالوں میں مستغرق تصویر کشی میں مصروف رہی۔ عاصم چند لمحوں تک اس کے قریب چپ چاپ کھڑا ایزل پر لگی ہوئی ادھوری تصویر کو دیکھتا رہا۔ جو آہستہ آہستہ حجاب کی سبک خرام اور معجز نما انگلیوں کی صلاحیتوں کی بدولت تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی۔ تصویر انسانی زندگی کے اُس پہلو کی حقیقی نمائندہ تھی جو عبرت ناک مرقع بن کر دلوں میں درد انگیز جذبات کو جنم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسے آشفتہ سر نوجوان کی پورٹریٹ تھی جس کا چہرہ بے پناہ اُداسیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

"بہت خوب!" تعریف کے الفاظ خاموش فضا میں دھماکہ بن گئے۔ حجاب نے سراسیمہ نگاہوں سے دیکھا تو اُس کی پیشانی پسینے سے تر بہ تر ہو گئی۔

"اس طرح آپ کی خلوت میں دخل اندازی کی معافی چاہتا ہوں۔" اُس کے لہجے میں شرمندگی رچی بسی تھی۔ "مگر اس تصویر کو دیکھنے کی خواہش...." وہ رُک گیا۔ اُس کی زبان خیالوں کا ساتھ نہ دے سکی۔ حجاب کی آنکھیں بھٹی سے نکلے ہوئے لوہے کی طرح تپ رہی تھیں۔ اُس کا چہرہ انجانے جذبوں کی آگ میں یوں سُلگ رہا تھا کہ عاصم خوفزدہ ہو گیا۔ آگ.... آگ.... جیسے اُس کے چہرے کے آتش دان میں عاصم کی روح سوکھی لکڑی کی مانند جل اُٹھی ہو۔

"مجھے.... مجھے.... معاف کیجیے۔" وہ بری طرح بوکھلا گیا اور اُس کے آتشیں چہرے کی تمازت سے خود کو بچاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کی سانسیں پھول رہی ہیں۔ ہاتھوں میں ارتعاش ہے۔ نہ معلوم کتنی دیر تک اُس کا ذہن پریشان خیالات سے مملو رہا۔

اگلے چند روز وہ ایک عجیب سی غیر مانوس کیفیت سے ہمکنار رہا۔ گھر اپنا تھا۔ گھر والے اپنے تھے مگر بار بار اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی اجنبی جگہ پر آ گیا ہو۔ جانی پہچانی فضا سے اجنبیت کی بُو آ رہی تھی۔ اگرچہ گھر کی آبادی میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا تھا مگر خاموشی کئی گُنا بڑھ گئی تھی۔ ملازم چپ چاپ مشینی انداز میں مصروف رہتے۔ اتنے بڑے گھر میں کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ جس سے وہ بات چیت کر سکتا۔ اُس کے سارے قریبی دوست موسمِ گرما کی چھٹیوں کے سبب شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ تنہائی کے تپتے ہوئے عظیم ریگستان میں اُس کا ذہن بے مقصد بھٹکتے بھٹکتے تھک گیا تھا۔ والد صاحب سے تقریباً اس کی بات چیت بند تھی اور پھر ان دنوں اُنہوں نے ایک نئے راستے کو اپنا لیا تھا ــــــ شادی کے بعد کچھ روز تک مسرت کے سبب ان کی باچھیں کھلی رہی تھیں مگر اب تو جیسے ان کو بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔ صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتے اور بڑی رات گئے اُن کی واپسی ہوتی ــــــ کبھی اتفاقاً باپ بیٹے کا سامنا ہو جاتا تو وہ نظر بچا کر عاصم کے قریب سے گزر جاتے اور حجاب ــــ وہ یا کمرے میں تصویر کشی کرتی رہتی یا پھر ملازمین کو مختلف

ہدایات دیتی رہتی۔ بے کار بیٹھنا اُسے گوارا نہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد عاصم نے پھر کبھی اُس کے قریب جانے کی کوشش نہ کی۔ ویسے کئی بار اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اُس سے کچھ کہنے کی خواہاں ہے مگر عاصم کو ہنوز اس کی آگ برساتی ہوئی آنکھیں یاد تھیں!!

اور پھر ایک دن وہ تنہائی سے گھبرا کر گھر سے نکل گیا۔ نہ معلوم کتنی دیر تک بے مقصد سڑکوں کی پیمائش کرتا رہا۔ باہر بلا کی گرمی تھی۔ لُو کے آتشیں جھکڑ چل رہے تھے اور تا حدِ نظر سڑکوں پر ہر طرف اُلّو بول رہے تھے۔ مگر وہ نامعلوم خیالوں میں مستغرق موسم کی نامہربان ستم کوشیوں سے بے نیاز بڑی دیر تک سڑک گشتی میں مصروف رہا ــــــ اور جب اس کی متلون مزاجی اس مخصوص مہم جو یا نہ تفریح سے بھی اکتا گئی تو وہ اُلٹے قدم گھر کی طرف روانہ ہو گیا ــــــ مگر اچانک گھر کے قریب پہنچ کر وہ بے اختیار چونک پڑا۔ اس کے قریب ہی ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹیک لگائے کوئی کھڑا بنا پلک جھپکائے یک ٹک اس کے بنگلے کی بالکونی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ ایک آشفتہ حال نوجوان تھا۔ پیشانی پر آڑی ترچھی لکیریں بکھری ہوئی تھیں۔ شیو بڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور سر کے بال زلفِ گیتی کی طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں عاصم نے محسوس کیا کہ وہ اُس کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ اُس نے جیسے کہیں دیکھا ہو ــ مگر کہاں؟ اور پھر جوں ہی اُس نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا تو اس کی آنکھوں میں نہ معلوم کتنے گرتے ہوئے ستاروں کی دُھول بکھر گئی۔ آسمان جیسے اُس کے سر پر آ گیا ــــ وہ ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑتا ہوا دیوانہ وار گیٹ میں داخل ہو گیا۔ دو تین نوکروں نے اس کی حرکت کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھا مگر اسے تو کسی چیز کا بھی ہوش نہ تھا۔ پل بھر میں وہ راکٹ کی سی سرعت سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ پھر زقندیں بھرتا ہوا راہداری کو طے کیا اور تیزی سے حجاب کے کمرے میں گھس گیا۔ کمرے کے وسط میں ایزل پر ایک باریک سا نقاب پڑا ہوا تھا جو اُس کے ہاتھ کے ایک زوردار جھٹکے سے اُلٹ گیا۔ اور پھر اُسے پتہ چلا کہ اس نے اس نوجوان کو کہاں دیکھا تھا۔ ایک ہتھوڑا سا اس کے دماغ پر پڑا اور کچھ دیر تک وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو گیا۔ اندھیرے نے اُس کے گرد ایک دبیز دیوار کھڑی کر دی تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ حجاب اُس کے بالکل قریب کھڑی ہے۔

آج اُس کی آنکھوں کے شعلے بجھ گئے تھے۔ چہرے کا آتشدان سرد ہو چکا تھا۔

اور پھر کتنے سارے بے کیف اور بے رنگ دن گزر گئے۔ اُس کے مردہ دل کی افسردگی کی کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ زندگی ایک درماندہ مسافر تھی کہ تھک کر چور چور ہو گئی تھی ـــــ اور پھر اس حادثہ کے بعد تو جیسے سناٹا گھر کا مقدر بن گیا تھا۔ عاصم کی بے چینی بڑھتے بڑھتے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اُس کے باپ کی نفرت کا پودا بڑھتے بڑھتے ایک طویل قامت درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اب تو اس کے نزدیک ان کی حیثیت ایک قاتل سے کسی طرح کم نہ تھی۔ نازک دلوں کے حیات افروز جذبات کو بے دردی سے کچلنا قتلِ عمد ہی تو تھا۔ عاصم کا دل انقلاب انگیز باغیانہ خیالات سے لبریز ہو گیا ـــــ پھر کتنے دنوں کی مستقل سوچ کے بعد ایک دن علو ہمتی کو ہمراہ لئے وہ اپنے باپ کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا جیسے ڈوئل لڑنے سے قبل حریف ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگاتے ہیں۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اس کے لہجے میں لکنت نہ تھی۔ دل کی دھڑکنیں معمول پر تھیں۔ انہوں نے ایک جھلستی ہوئی نگاہ عاصم پر ڈالی اور ایک لمحے کے لئے اُس کے ارادے متزلزل ہو گئے۔

"جو کچھ تمہارے دل میں ہے، مجھے اس کا علم ہے۔" اُن کی آواز زخموں سے چور تھی۔ "جاؤ وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔ جاؤ۔۔۔"

اور عاصم کو جیسے حیرت نے گنگ کر دیا۔ یہ کس قسم کا ڈوئل تھا کہ جس میں حریف نے تلوار اٹھانے سے قبل شکست تسلیم کر لی تھی۔ اس کے سارے کھولتے ہوئے انقلابی جذبے اور باغیانہ خیالات برف بن گئے۔ اُس نے سوچا اس کو کچھ کہنا چاہئے مگر زبان تو جیسے اس کی تحویل ہی میں نہ تھی ـــــ وہ سوچ کے اُلجھے ہوئے دھاگوں میں بندھا وہاں سے لوٹ آیا۔

مگر اسی دن شام کو وہ ایک زبردست دھماکے سے دوچار ہوا۔ اُسے معلوم ہوا کہ حجاب نے اس بندگی اور غلامی سے کنارہ کش ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ ان تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے اس کے ہوش گم کر دیئے تھے۔

وہ تھکے ہوئے قدموں سے راہداری طے کر رہا تھا کہ حجاب کے کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہ ایزل کے سامنے کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ کا برش سبک رفتاری سے آشفتہ حال نوجوان کی پورٹریٹ پر اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ اور پھر چہرے کے سارے خطوط، سارے نقوش ناقابلِ شناخت ہو گئے۔ رنگوں کا بھدا سا ایک ہیولہ کینوس پر نمودار ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود اس کی دو ویران آنکھیں باقی رہ گئی تھیں جو اس وقت گہرے رنگوں کے ہیولے میں گھری ہوئی یوں گھور رہی تھیں جیسے خلا میں اپنے نامکمل خوابوں کو تلاش کر رہی ہوں۔ شاید ان دو آنکھوں میں دو ہستیوں کا مشترک غم اپنے سنہرے خوابوں کے لٹنے پر چپ چاپ آنسو بہا رہا تھا!!
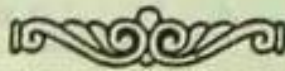
پچھلی شب کا غم

صبح اس کی آنکھ کھلی تو پچھلی شب کے غم کا احساس اس کے گرد اس طرح ہالہ بنا کر بیٹھ گیا جیسے اس کے بیدار ہونے کا منتظر ہی تو تھا! اور تب اس کا ذہن الجھنوں کے ملبے تلے دب کر رہ گیا۔ دل غم و غصہ سے لبریز ہو گیا۔ آنکھوں میں سرخیاں تیرنے لگیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس زور سے چیخنا شروع کر دے کہ صبح کے بسیط اور کیف زا اجالے اپنا سینہ تھام کر رہ جائیں اور ہر طرف درد بھرے نغموں کی صدائیں گونجنے لگیں۔

سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس کے الجھے ہوئے پریشان بالوں کے پس منظر میں اس کی پریشانی سر اُٹھا اٹھا کر ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ شیو بڑھ گیا تھا اور داڑھی کا ہر بال ایک کٹار بن کر اس کے گالوں کو زخمی کر رہا تھا۔ ایک ہی رات میں اس کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ گال اس طرح اندر کی طرف دھنس گئے تھے جیسے ان پر ہل چلا دیا گیا ہو۔ گردن کی شہ رگ اس طرح پھول گئی تھی جیسے اس میں درد و آلام کی مسموم ہوا بھر دی گئی ہو۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ہی رات میں اس کی عمر نے کئی برس کی طویل چھلانگ لگا کر بڑھاپے کی دہلیز پر قدم جما لئے ہوں۔

اُس نے اپنی پریشانی سے دست و گریبان ہوتے ہوئے سگریٹ کا آدھا ٹکڑا دریچہ کے باہر پھینک دیا اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے تکیئے کو زور سے یوں دبانے لگا جیسے اپنی شکست کا بدلہ اس سے لے رہا ہو۔ پھر اس نے تکیہ ایک طرف رکھ کر کمرے میں ناچتے ہوئے اُجالوں کے دامن میں لہراتے ہوئے سناٹوں کے متعلق سوچا۔ آج گھر کی ہر شے

بجھی بجھی سی نظر آرہی تھی جیسے اس کی حسرت پر اشکبار و سوگوار ہو۔ ایک ہی رات میں کائنات بدل گئی تھی۔ شگفتہ چہرے کی مسکراہٹ پر غم کی دھول بکھر گئی تھی۔ خوشیوں پر آنسوؤں کی چادر پھیل گئی تھی اور پُر کیف اور نشاط ریز راتوں کی خاموشیوں میں دیکھے ہوئے سندر سپنوں کی تعبیر نے اس کے دل کو دہلا دیا تھا —— اور یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہوا تھا۔!

لڑکھڑاتے قدموں سے وہ کمرے سے نکلا۔ آج کا تازہ اخبار صحن میں پڑا تھا۔ اس کے مردہ قدموں میں یک بیک ایک نئی جان آگئی۔ وہ راکٹ کی سی تیزی سے اخبار کی طرف یوں لپکا جیسے اس میں اس کی قسمت کا حال لکھا ہو۔ دیوانوں کی طرح اخبار کو ہاتھ میں لیا۔ اس کی نظریں جلدی جلدی سرخیوں کی طرف لپکیں۔ مگر اس کو وہ خبر نہ مل سکی جس نے ایک ہی رات میں اس کی دُنیا کو اُجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹوں کی کلیوں کو مسل دیا تھا — اور تب ایک خوش آئند خیال اس کے ذہن کے پردے پر سرسرایا۔ "تو کیا اس کو غلط اطلاع ملی؟" ایک ہلکی سی خوشی نے اس کے دل میں جنم لیا۔ اخبار اس کے ہاتھ سے گر گیا اور بیچ کا صفحہ اپنے ساتھی صفحات سے بچھڑ کر قریب کی کیاری کے اندر چلا گیا۔ وہ شہادت کی انگلی کو پیشانی پر رکھ کر غور و تعمق میں ڈوب گیا۔ اس کو اس خبر کی صحت پر کوئی شبہ نہ تھا کیونکہ جس ذریعے سے اس نے یہ بات سنی تھی اس کے غلط ہونے کا امکان تقریباً ناممکن تھا! اور پھر اس کا تجربہ اس کو ماضی میں کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ مگر اس موڑ پر آکر وہ کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر خبر معتبر تھی تو وہ آج کے اخبار میں کیوں نہیں چھپی؟ دل نے اس کو خبر کے غلط ہونے کا مژدہ سنا کر اس کو تسلیاں دیں۔ بہلاوؤں سے اس نے غم کو غلط کرنا چاہا۔ مگر اس کا ذہن دل کی بات کو تیار نہ تھا۔ اس نے پھر اخبار اٹھایا اور بے دلی سے سب سے بڑی سرخی کو دیکھا اور تب جیسے اس کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا۔ وہ ہلدی کی طرح پیلا ہو گیا۔ اس کے جسم کا ہر حصہ کسی ٹوٹی ہوئی موٹر کے ڈھانچے کی طرح لرزنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مستقبل کی تاریکیاں لہرا اٹھیں۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ خبر تو سب سے بڑی سرخی کا روپ دھارے بیٹھی تھی جس پر ابھی تک اس کی نظر ہی نہیں گئی تھی۔ اس نے اخبار کو وہیں پھینکا اور اپنے کمرے کی طرف قیامت کی تیزی سے بڑھنے لگا

مگر چند قدم چل کر وہ ایک خالی بالٹی سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اس کے دل میں غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اٹھا کر اس زور سے بالٹی کو دور پھینکا کہ اس کی آواز سن کر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی ایرانی بلی اپنے جسم کے بال پھلا کر تیزی سے دیوار پر چڑھ گئی اور خوفزدہ نظروں سے اس کو دیکھنے لگی۔ اس نے کمرے کی طرف بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں ستون کو دونوں ہاتھوں سے لپٹا کر آنکھیں موند لیں ـــــ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سینے پر کوئی بھاری قدموں سے چل رہا ہو!!

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ چونکا۔ اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا دودھ والے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بوجھل قدموں سے رسوئی میں داخل ہوا۔ پتیلی لے کر باہر نکلا اور دودھ لے کر پھر رسوئی میں پہنچا۔ نعمت خانہ میں پتیلی رکھ کر اس نے چولہا جلایا اور کیتلی میں چائے کا پانی ڈال کر اس کو چولہے پر رکھ دیا ـــ اب وہ قریب ہی چوکی پر بیٹھا دونوں ہاتھ ٹھوڑی پر رکھ کر خاموش اور اداس نظروں سے چولہے کو دیکھ رہا تھا! پہلے چولہے میں سے دھواں نکل کر کیتلی کو گھیرنے لگا۔ دھواں پھر آہستہ آہستہ فضا میں بکھر گیا اور چند لمحوں بعد صرف نیلی آگ رہ گئی۔ وہی آگ جو اس وقت اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی، جس کی تپش سے اس کی روح جل رہی تھی۔ اپنی مجبوریوں پر اس نے غور کیا تو اس کا جی چاہا کہ آنسوؤں کا دریا بہا دے مگر آنسو بھی تو اس کے دل کے سوتے میں خشک ہو چکے تھے۔ جس طرح پانی گرم ہو کر بھاپ بن جاتا ہے اسی طرح اس کے آنسو غم کی تپش سے آہوں میں ڈھل کر رہ گئے تھے۔ بھاپ فضاؤں میں بکھر جاتی ہے اور اس کی آہیں ہولے ہولے سینے سے اُٹھ کر حلق کی طرف آتی تھیں اور پھر لبوں سے پھسل کر فضاؤں میں گم ہو جاتی تھیں۔

اس کی بیوی دونوں بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔ وہ اس سے حد درجہ ناراض تھی۔ اس نے جاتے وقت ببانگ دہل کہہ دیا تھا کہ وہ اس وقت تک اس کے گھر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھے گی جب تک وہ اپنے اطوار و کردار میں تبدیلی نہیں لائے

گا۔ اس کے جانے کا اس کو مطلق غم نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے خوش ہی تھا کیونکہ اس کے نزدیک اس کی بربادیوں کی ذمہ دار وہی تھی۔ وہی اس کے لئے تباہی کی سوغات لائی تھی۔ کئی مرتبہ اس نے تنہائی میں اپنے اس خیال کی تائید کے لیے ثبوت ڈھونڈھے تھے مگر اس کو ثبوت تو درکنار ایک ایسا معمولی واقعہ بھی یاد نہیں آیا تھا جس کو پیش نظر رکھ کر وہ کہہ سکتا کہ واقعی اس نے اس کو برباد کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کا خیال تبدیل نہیں ہوا تھا۔ وہ تو مطمئن تھا کہ وہ چلی گئی ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اس کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا!!۔

یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ اب وہ اس عورت سے متنفر تھا جس کو شادی کے بعد وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کا گلابی حُسن، اس کی نستعلیق چال دیکھ کر وہ ڈر جاتا کہ بُری نظر اس پر نہ منڈلانے لگے۔ کوئی بلا اس کے قریب نہ آجائے! اس کی ایک میٹھی نگاہ اس کے لئے امرت تھی۔ مگر اب!!! اب وہ اس کی جان کا دشمن تھا۔ اب یہ بات بھی نہ تھی کہ اس کی بیوی رقیہ بدچلن و بدکردار تھی اور نہ وہ کاہل و بدزبان تھی۔ وہ تو امور خانہ داری میں طاق دکھتا تھی۔ انداز گفتگو بھی شائستہ اور شریفانہ تھا شوہر سے محبت کرنا اس کا مذہب تھا۔ گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش و پرداخت میں اس نے خود کو وقف کر دیا تھا مگر اس کے باوجود شومئ قسمت سے وہ اپنے شوہر کی آنکھ کا کانٹا بن گئی تھی۔

شادی کے پہلے ڈھائی سال سکھ چین اور اطمینان سے گزرے تھے۔ ہر روز عید تھی اور ہر شب، شبِ برات!! ان کے اردگرد خوشیوں کا ہجوم تھا مسرّتوں کی دھوم تھی۔ لبوں پر شگفتہ مسکراہٹوں کا راج تھا اور دل شادمانی کے احساسات سے مالامال! مگر پھر اس کے بعد سے خوشیاں اٹھ گئیں۔ کیف و انبساط کا نشہ ہرن ہوگیا۔ اور درد و آلام نے اپنی بھرپور قوت وصولت کے اظہار کے لئے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا اور گھر جہنّم کی بھٹّی بن کر رہ گیا۔ شادی کے ٹھیک ڈھائی سال کے بعد احسان نے رقیہ کی سہیلی آمنہ کو دیکھا اور اپنا دل تھام کر رہ گیا۔ پہلی مرتبہ اس کو احساس ہوا کہ اس نے رقیہ

سے شادی کر کے ناقابلِ تلافی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اپنی زندگی کے لمحات کو آتش دوزخ سے بھر لیا ہے۔ شادی تو اس کی آمنہ سے ہونی چاہیئے تھی۔ آمنہ جو رقیہ کی شخصیت کے ٹمٹماتے چراغ کے مقابلے میں ایک روشن سورج کے مماثل تھی۔ جو ماڈرن سوسائٹی کے زریں اصولوں سے کلی طور پر بہرہ ور تھی۔ جس کی راتیں ہوٹلوں اور کیبروں میں سراپا دلہن بن کر پھول کی طرح مسکراتی تھیں۔ زندگی کو وہ ایک خوشگوار کھیل سمجھتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ہار جیت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کا قول تھا کہ انسان وہ ہے جو ہار کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کرے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ ہار کے زخم کی ٹیسوں سے ہنوز ناآشنا تھی۔

جب احسان نے رقیہ اور آمنہ کا موازنہ کیا تو اسے محسوس ہوا کہ دونوں میں بُعد القطبین ہے۔ رقیہ معمولی پڑھی لکھی تھی۔ مشرقی تہذیب کا منفرد رنگ اس کی ذات میں رچا بسا ہوا تھا۔ اس کو نہ دنیا سے کوئی علاقہ تھا نہ دنیا کے حالات سے غرض! اس کی جنت اس کا گھر تھا اور شوہر کی پرستش اس کا کیش! وہ فرسودہ رسم و رواج کی حدوں سے نکلنا گناہِ کبیرہ سمجھتی تھی۔ اس کی نظروں میں پارٹیوں اور مغربی کلچر کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جسموں کے قوسوں اور خطوط کو ابھارنا اس کے نزدیک بے شرمی کا مظاہرہ تھا۔ اور اس کی یہی ایک خوبی احسان کے لئے ایک بدترین خرابی بن گئی۔ آمنہ نے جیسے اُس کی دنیا میں قدم رکھ کر رقیہ کے ان عیوب کو نگاہوں کے سامنے عریاں کر دیا تھا۔ جن کو وہ اتنے عرصہ تک دیکھ ہی نہ سکا تھا۔ گھر کا ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ اب وہ پہلے والا احسان نہ رہا تھا۔ دو چار ہی ملاقاتوں میں وہ آمنہ کا اس درجہ شیدائی ہو گیا کہ وہ کھلے الفاظ میں رقیہ کے سامنے اس کی برائی گنوانے لگا۔ اور آمنہ کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

"نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب ہم دونوں ایک بندھن میں جکڑ دیئے گئے تھے۔"

"خدا بیوی دے تو آمنہ جیسی دے جس کی وجہ سے گھر میں بھی رونق ہو، اور

سوسائٹی میں بھی عزت ہو۔"

"آمنہ تو ایک تراشا ہوا ہیرا ہے جس کی روشنی دل و دماغ دونوں کو روشن کرتی ہے۔"

"تم تو بالکل ہی اُجڈ اور جاہل ہو، سوسائٹی کے اصولوں سے ناواقف! تہذیب کے نام سے ناآشنا! آمنہ کو دیکھو وہ تو سوسائٹی کی روحِ رواں ہے۔"

رقیہ ایک شریف اور مشرقی گھرانے کی دوشیزہ تھی۔ جہاں اس کو اپنے شوہر سے محبت تھی وہاں وہ اس بات کی خواہاں تھی کہ اس کا شوہر بھی اس کے پیار کو اپنے دل میں سجائے ــــــ دوسری مشرقی عورتوں کی طرح وہ ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر یوں صاف صاف غیر مبہم الفاظ میں کسی دوسری لڑکی کی تعریف اس کے سامنے کرے۔ اس کی خوبیوں کو اُجاگر کرے اور اپنی ہی بیوی میں عیوب تلاش کرے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگی۔ احسان کی باتیں اس کے لئے زہر ہلاہل ثابت ہونے لگیں۔ وہ شروع ہی سے ناروا سلوک کی عادی نہ تھی۔ اس نے شادی کے فوراً بعد اپنے شوہر کو مہربان، محب اور دیوتا خصلت پایا تھا۔ اس کو صرف محبت ہی محبت ملی تھی۔ اس صورت میں تو احسان کا یہ نیا روپ اس کے لئے سوہانِ روح بن گیا تھا۔

آمنہ اور رقیہ بچپن کی سہیلیاں تھیں ایک ہی محلّے میں دونوں نے جنم لیا تھا۔ ایک ہی جگہ دونوں کے بچپن نے بے فکری کے گھروندے تعمیر کئے تھے۔ ایک ساتھ اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ مگر رقیہ کو میٹرک کے بعد اس کے رجعت پسند، دقیانوسی خیالات رکھنے والے والدین نے گھر میں بٹھا دیا تھا اور اس کے برعکس آمنہ نے گریجویشن کر لیا تھا۔ اب وہ پہلی والی سیدھی سادی آمنہ نہ تھی۔ اب اس کے طور طریقے اور اندازِ بود و باش سر تا سر بدل گئے تھے۔ وہ اب آزادی کی دلدادہ ہو گئی تھی۔ مگر یہ بات رقیہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ اس کے شوہر کو اس بے حیائی سے اپنی زلفوں کا اسیر کر لے گی۔ اس کا علم ہوتا تو وہ اس چڑیل کو احسان سے دور ہی رکھتی۔ مگر اب ــــــ اب تو چڑیوں نے کھیت چگ ہی لیا تھا۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا!!

گھر کا ماحول بد سے بدتر ہو گیا تھا۔صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔اب رقیہ کے ضبط کا پیمانہ بھی چھلک اٹھا تھا۔اس نے دبی آواز میں احتجاجی نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے تھے۔ مگر احسان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔وہ اس کی موجودگی میں آمنہ سے اس طرح ہنس ہنس کر گفتگو کرتا جیسے وہ اس کی شرعی بیوی ہو۔شاید اس نے رقیہ کو جلانے کی ٹھان لی تھی۔آمنہ کے آتے ہی رقیہ سے کہتا۔

"ارے رقیہ! مہمان کے لئے چائے لاؤ نا؟ کسی سے کیک پیسٹری منگوالو تو زیادہ بہتر ہے۔"

اس کی بات رقیہ کے دل کو جلا دیتی۔اس کا جی چاہتا کہ وہ چائے کے پانی میں زہر گھول دے تاکہ اس کلموئی اور ڈائن کا خاتمہ ہی ہو جائے جس نے اس کی خوشگوار زندگی کو تباہ کر دیا تھا۔ڈرائنگ روم میں دونوں کے قہقہے در و دیوار سے ٹکرا کر فضاؤں میں منتشر ہوتے اور دوسری طرف رقیہ کی روح کے گوشوں میں خط استوا کی حرارت بھر جاتی۔غم و غصہ کے امتزاج سے بدن تھر تھرا کر رہ جاتا۔

اور پھر ایک دن اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ احسان سے فیصلہ کن لڑائی لڑے گی جس کے بعد یا تو آمنہ کا اس گھر میں ہمیشہ کے لئے داخلہ بند ہو جائے گا یا وہ خود اس گھر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دے گی۔احسان لاکھ مرد سہی پھر بھی عزت دار تھا۔اپنی بے عزتی سے ڈرتا تھا۔اسے معلوم تھا کہ اگر بات گھر سے نکل کر اور کسی کے کانوں تک پہنچ گئی تو اس کا بدنام ہو جانا عین ممکن ہے۔آج کل زمانہ بھی خراب ہے۔بات کا بتنگڑ بنانا دنیا والوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔اگر ان لوگوں کو اس کے گھر کے موجودہ حالات کا ذرا سا بھی پتہ چل گیا تو پھر اس کا سڑک پر چلنا دشوار ہو جائے گا۔

اس دن کے بعد پھر کبھی آمنہ نے اس گھر میں قدم نہیں رکھا مگر انہیں باہر ملنے پر کوئی قوت قدغن نہ لگا سکی۔کبھی دونوں کسی ائیر کنڈیشنڈ کیفے کے پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر گھنٹوں خوش گپیوں اور پُر لطف باتوں میں گزار دیتے اور جب تھک جاتے تو کسی پارک میں شبنمی گھاس پر ٹہلتے ہوئے بالیدگی و آسودگی محسوس کرتے! پھولوں کو ہاتھ سے چھو کر ان کی خوش بختی کا اندازہ لگاتے! یہاں سے بھی دل اکتا جاتا تو سینما میں تین گھنٹے گزار دیتے۔

ان ملاقاتوں کی وجہ سے اب احسان روز رات کو دیر سے آنے لگا تھا۔ رقیہ لاکھ جاہل سہی مگر اتنی بے وقوف بھی نہ تھی۔ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس کو بھی زندگی کے گرم و سرد کا تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ بھی جان گئی کہ احسان اب آمنہ سے باہر ملتا ہے۔ اس نے تو یہ سوچ کر آمنہ کا پتہ کاٹا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے مگر جب دونوں پھول اور خوشبو کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تو اس کی جان جل کر رہ گئی اور وہ روٹھ کر دونوں بچوں کے ساتھ میکے چلی گئی۔

اب کیا تھا جیسے احسان کو قید سے رہائی نصیب ہو گئی۔ جیسے اسے ہفتِ اقلیم کی دولت حاصل ہو گئی۔ وہ آزادانہ آمنہ سے ملنے لگا۔ اب اس کے چاروں طرف خوشیوں کی بارات تھی۔ اس کے لمحات میں رنگین و کیف افزا سویروں کے اجالے مسکرا رہے تھے۔ رقیہ کو گئے دو مہینے ہو چکے تھے مگر اس سے ملنا تو دور کی بات، ایک مرتبہ بھول کر بھی اس نے فون نہیں کیا۔ بلا خود بخود ٹل گئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ دوبارہ اس کو گھر مدعو کرنا حماقت انگیز بات ہو گی!!

اور پھر ایک دن اُس نے سوچا کہ وہ رقیہ کو طلاق دے کر اپنی تکالیف کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دے گا۔ آمنہ کو شریکِ حیات بنانے کا اُس نے پکا ارادہ کر لیا تھا تاکہ زندگی کی راہوں میں خوشیوں کے اجالے پھیل جائیں۔ روح پر ایک نکھار آ جائے۔ اور پھر آمنہ نے بھی اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا!

اس دن وہ بے حد خوش تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بار بار پیار کے انمول گیت گنگنائے، لبوں کو مسکراہٹ کی کلیوں سے مزین کرے۔ وہ ایک کافی ہاؤس میں بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا کہ اس کا ایک دوست آ گیا۔

"آؤ پیارے تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو" اس کو دوست کی آمد گراں نہیں گزری۔ وہ اس کا پرانا یارِ غار تھا اور مدت کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

"ہاں یار تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مگر کیا کروں؟ یہ سالی اخبار کی ملازمت ہی ایسی ہوتی ہے۔ فرصت کا ہم صرف نام ہی سنتے ہیں، اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔" احسان نے اس کے لئے چائے کا آرڈر دیا اور اس کو ایک سگریٹ پیش کر کے بولا۔

"سناؤ یار اختر! کوئی نئی خبر! تم تو اخبار کے رپورٹر ہو۔"

"اوہ! نئی خبر — ہاں — میرے پاس ایک نئی خبر ہے۔ مگر ممکن ہے تم کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔" اختر نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"مگر اس کے باوجود میں اس کو سننا پسند کروں گا۔" احسان مسکرا کر بولا۔

"آج شادی سے متعلق اسمبلی میں قانون پاس ہو گیا ہے۔ اب کوئی مرد بلا جواز دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس قانون کی رو سے حکومت عورت کو اس کے پورے حقوق دلائے گی۔"

"ک — کیا —" احسان کے لبوں کی مسکراہٹ ڈوب گئی۔

"ہاں یار! میں تو سمجھتا ہوں ٹھیک ہی ہوا۔ میں مرد ہوں مگر اس کے باوجود کہوں گا کہ ہمارے ہم جنسوں نے عورتوں سے انصاف نہیں کیا۔"

اب احسان کا وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اختر تمسخر انگیز انداز میں اس پر طنز و تعریض کے تیر برسا رہا ہو۔ اس نے بل ادا کیا اور خرابی طبیعت کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کپڑے پھاڑ کر زور زور سے رونا شروع کر دے — آنسوؤں کے دریا بہا دے اور ان میں ساری دنیا کو غرق کر دے۔ آہ! اتنا ظلم۔ اتنا ستم! اس کی روح پر آرے چلنے لگے۔ اس کا بس چلتا تو وہ ایسے قانون کی دھجیاں اڑا دیتا جس نے اس کی خوشی کی دنیا کو تحس نحس کر دیا تھا۔

وہ رات اس نے کس طرح کاٹی، یہ اس کا جی جانتا تھا۔ ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ نہ سو سکا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نیند نہ تھی بلکہ غم کی زیادتی سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ صبح جب اس نے وہ خبر پڑھی تو اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ آرزوؤں کے چمن میں آگ لگ گئی تھی۔ تمناؤں کی محفل سونی ہو گئی تھی۔ وہ سچ مچ رو پڑا۔

دفعتاً اس کے خیالات بکھر گئے۔ اس کی آرزوؤں کی طرح! کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے اٹھا اور بڑھ کے دروازہ کی کنڈی کھول دی۔ اور تب حیرت و استعجاب سے اس آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے سامنے اس کی بیوی اور اس کے دونوں بچے کھڑے تھے۔ رقیہ کے چہرے پر اس وقت غصے کے نشانات نہ تھے بلکہ اس کے لبوں پر فاتحانہ

مسکراہٹ جگنو بن کر چمک رہی تھی۔

"تم ــــ!"

اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" وہ ہنس دی" میرا گھر ہے جب چاہے آسکتی ہوں ــ"

"ہوں ــــ مگر تم آئیں کیوں جب کہ تم نے نہ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا" وہ غرّایا۔

"آج کا اخبار دیکھ کر میں نے فیصلہ تبدیل کر لیا ہے" وہ پھر ہنس دی اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو! وہ ایک طرف ہٹ گیا تاکہ رقیہ اور دونوں بچے گھر میں داخل ہو سکیں!!

محلّے کی عزّت

ساتویں جماعت میں ایک لونڈے کی نکسیر پھوڑنے کے جرم میں اسکول سے ایسے نکلے کہ پھر پلٹ کر دوبارہ شکل نہ دیکھی۔ وہ تو کہیئے کوئی نیکی آڑے آگئی تھی ورنہ اس دوزخ سے نکلنے کے لئے انہیں کوئی دوسرا راستہ ہی اختیار کرنا پڑتا۔ گھر والوں نے لاکھ سر مارا۔ ہزاروں کوششیں کیں مگر ان کی متلوّن طبیعت پڑھائی کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ جو شخص کتابوں کو مستقل روگ سمجھتا ہو وہ بھلا کیسے کتابوں کو سینے سے لگا سکتا ہے۔ جب ایک بار بوڑھے باپ نے غصّہ میں آکر اس اکل کھرے، بدمزاج اور ناقابلِ علاج لونڈے کو راہِ راست پر لانے کے لئے اُلٹا لٹکا کر بے بھاؤ کی برسائیں تو دماغ کی رگ کچھ اور بھڑک گئی اور یہ گھر سے ایسے نکلے ہوئے کہ ضعیف العمر ماں کا بلڈ پریشر دو سو چالیس تک پہنچ گیا۔ باپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور جب یہ تلاشِ بسیار اور تگ و دو کے بعد گھر پہنچے تو آتے ہی اعلان کر دیا۔

"اب کسی نے میرے سامنے مدرسہ کا نام لیا تو میں کسی کھائی میں کود جاؤں گا۔" صبح کا بھولا بھٹکتے بھٹکتے شام کو گھر واپس آجائے تو ظاہر ہے اُس کی قدر ہوتی ہے۔ اور اب کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ گھر سے نکلنے کا نام لیں۔ ماں نے ان کی بلائیں لیں۔ صدقہ اتارا۔ سات فقیروں کو کھانا کھلایا۔ مسجد میں دِیا جلایا اور بیانگِ دہل کہہ دیا۔

"اب میرا چاند کبھی مدرسہ نہیں جائے گا۔ پڑھے نہ پڑھے مگر جیتا رہے۔" اور اس مژدۂ جان فزا کو سن کر اُن کے پریشان چہرے پر سُرخ سُرخ رنگ پھیل گیا۔ اُسی دن کورس کی کئی کتابوں کو آدھی سے کم قیمت پر فروخت کر کے یاروں کے ساتھ ایک نئی

فلم دیکھی اور شام کو ہلکے ہلکے سروں میں ایک گیت الاپتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کا سینہ شادمانی کے احساس سے مرغے کے سینے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ماں نے بیٹے کو مُسرور دیکھا تو خود خوشی سے پھول گئی۔

پڑھنا لکھنا تو اب تھا نہیں۔ تنہائی کی حدوں کو عبور کرنے کے لئے انہوں نے محلّے کے کم عمر شہدوں کی صُحبت کو اپنا لیا۔ اپنے گھروں کو بائن طلاق دے کر نکلے ہوئے یہ لُچّے محلّے کے بزرگوں اور شریفوں کی آنکھوں کے کانٹے تھے۔ اُن کے عادات واطوار اور چال چلن رحمٰن میاں کو ایسے بھائے کہ یہ انہیں کے ہو کے رہ گئے۔ لبوں پر پان کی سرخیاں لئے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں شان سے ایک سستی سگریٹ دبائے یہ اُنہیں کے آگے پیچھے گھومتے رہتے۔ ان کی تقلید کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے اور ان کی ہر صدا پر لبیک کہنا ان کے لئے جیسے ضروری ہو گیا تھا۔ یوں تو سب چرس کے عادی تھے۔ بھنگ گھوٹ کر پیتے تھے۔ اگر کہیں سے ٹھرا مل جاتا تو اُسے بھی نہیں چھوڑتے۔ مگر اس کے باوجود ان لونڈوں میں ایک بہت بڑی خوبی تھی۔ محلّے کی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ اگر کسی لڑکی کو آتا دیکھتے تو فوراً پیچھے ہٹ جاتے یا اپنی گردنیں جھکا لیتے جیسے رکوع میں ہوں اور یہ بات رحمٰن میاں کے دل کو شدّ و مد سے لگی تھی!

رحمٰن میاں کے بازو فولاد کی سلاخیں تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں آسمانی بجلیوں کی چمک تھی۔ ان کا چوڑا چکلا سینہ لوہے کے ایک وزنی صندوق کی مانند تھا۔ اُن کی آواز شیر ببر کی دھاڑ جیسی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں اُنہوں نے ایسی ترقّی کی کہ محلّے کے بدمعاشوں کی فوج کے چیف آف اسٹاف ہو گئے۔ اب سب انہیں اپنا گورو تسلیم کرنے لگے تھے۔ ان کے اشاروں پر چلنا سب کے لئے فرض ہو گیا تھا۔ جس طرح کسی ملک میں انقلاب آتے ہی نئی حکومت کی پالیسی بالکل ہی بدل جاتی ہے اُسی طرح کمان سنبھالتے ہی انہوں نے چند اصول بنائے اور اُن پر سختی سے کاربند رہنے کا عزمِ صمیم کر لیا۔ جن میں سے ایک اصول یہ بھی تھا کہ محلّے کی عزّت کا ہر ایک محافظ ہوگا اور عزّت پر شب خون مارنے والے بیرونی حملہ آوروں کا قلع قمع کیا جائے گا۔ اگر کسی نے محلّے کی کسی لڑکی کی طرف بُری نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی تو اس کو عبرت ناک سزا دی جائے گی اور اس قسم کے دوسرے بہت سارے اصول!! اُسی دن سے اُن پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ بُرے اور پراگندہ

عناصر کا پتہ چلانے کے لئے رحمٰن میاں نے بہت سے چالاک کن سوئیے چھوڑ دیئے ۔ جو ہمہ وقت جاسوسوں کی طرح اِدھر اُدھر گھوم پھر کر معلومات حاصل کرتے تھے ۔ اور پل پل کی خبر رحمٰن میاں تک پہنچایا کرتے تھے ، جو غور و تعمق کی گہرائیوں میں ڈوب کر حالات کی روشنی میں مشکلات کا حل تلاش کرتے تھے ۔ ہر کو اپنی ذمہ داری کا اچھی طرح احساس تھا ۔ وہ دنیا والوں کے مدح و ذم سے بے نیاز اپنی ڈیوٹی بحسن و خوبی انجام دے رہے تھے ۔ انہیں تو بس اپنے کام سے کام تھا ۔ اُن کا کیش لاف و گزاف نہ تھا ۔ اگر رحمٰن میاں کو پتہ چل جاتا کہ کسی نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے ۔ غفلت سے کام لیا ہے تو وہ اس کو ایسی کڑی سزا دیتے کہ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے ۔ اُس کو جسمانی تو نہیں روحانی صدمے سے ہمکنار ہونا پڑتا ۔ اور آئندہ وہ ایسا محتاط ہو جاتا کہ غلطی کا احتمال نہ ہوتا ۔ وہ چاہتے تو غلطی کا ارتکاب کرنے والے کا مار مار کے بکل ادھیڑ سکتے تھے ۔ مگر وہ ایسا تو نہ کرتے بلکہ ایک ہفتہ کے لئے اُس کے حقے کی چرس یا بھنگ بند کر دیتے اور جب یہ راشن اُس کو نہ ملتا تو اُس کی حالت غیر ہو جاتی ۔ دنیا کی ہر خوشی اُس کے لئے اجڑ جاتی اور زندگی بغیر نمک کے سالن کا ذائقہ بن جاتی ۔ اور یہی سزا اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ۔

اپنی پارٹی کا صدر بننے کے بعد اُن کا چہرہ کسی جابر و قاہر ڈکٹیٹر کی طرح متین و سنجیدہ ہو گیا تھا ۔ مسکراہٹ لبوں سے یوں چلی گئی تھی جیسے اُن سے خفا ہو ۔ آنکھوں میں ہمہ وقت غور و فکر کی پرچھائیاں اس طرح رقص کرتیں جیسے وہ ان کا گھر ہو ۔ اور پھر جوں ہی نئی داڑھی نے چہرے پر اپنا رنگ جمایا تو انھوں نے اس کا اس طرح گرم جوشی سے خیر مقدم کیا تھا جیسے سرکاری طور پر دوسرے ملک سے آئے ہوئے صدر کا استقبال کیا جاتا ہے ! اور بھول کر بھی اس کو اُسترا دکھلانے کی کوشش نہ کی ۔ چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی مونچھوں کو وہ روزانہ پابندی سے اس طرح گھی سے چپڑتے تھے جیسے اُن کے ایسا نہ کرنے سے مونچھیں چہرے سے اڑ جائیں گی ۔ سُرخ کناروں والی سفید براق تہمد اور اسی رنگ کا واسکٹ ان کا پسندیدہ اور مخصوص لباس تھا ۔ قمیض رنگ برنگی ہوتی ۔ گلے میں ہر وقت کالا رومال پڑا رہتا ۔ پاؤں میں پشاوری چپّل اور ہاتھ میں بید کی ایک چھڑی ——— اسی حلیئے میں وہ روزانہ محلّے کے دو تین چکر

لگایا کرتے تھے۔ محلے والوں کی شکایات سنتے۔ مشکوک افراد پر کڑی نگاہ رکھتے ـــــ لوگوں کی پریشانیاں دور کرنے کی کوشش کرتے۔ اور انہیں ہر قسم کی مدد کا یقین دلاتے ـــــ گھر میں ان کی عزت صفر تھی۔ باپ تو اُن کی صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ ماں اُن کی حرکتوں پر کڑھتی تھی مگر محلے والے اُن کی بے حد عزت کرتے تھے۔ ان کے نام کی مالا جپتے تھے۔ بڑی بڑی عمر والے انہیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ اُن کی طاقت اپنا لوہا سب سے منوا رہی تھی یا واقعی وہ دل سے یہ سب کچھ کرتے تھے ـــــ مگر وہ کرتے ضرور تھے۔ جس راستے پر وہ نکل پڑتے، بھیڑ چھٹنے لگتی۔ ان کے لئے راستہ بنایا جاتا۔ جس دکان پر پہنچ جاتے، دکان دار اُن کی خاطر تواضع کی کوشش کرتے۔ مگر توبہ کیجئے۔ مفت کی چیزوں کی طرف تو وہ آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ اگر کوئی پیسے لینے میں حیلہ حوالہ کرتا تو وہ اُس کے منہ پر پھینک کر آجاتے مگر کسی کا احسان اپنی گردن پر نہیں لیتے۔

جہاں کہیں جھگڑا ہوتا۔ اُن کے چاق و چوبند کن سوئیے انہیں آگاہ کر دیتے اور وہ چھڑی ہلاتے ہوئے دو باڈی گارڈوں کی معیت میں طمطراق سے شاہانہ انداز میں جائے فساد پر پہنچ جاتے اور ایک ہی لحظہ میں فساد کا زور ٹوٹ جاتا۔ لڑنے والوں کو سانپ سونگھ جاتا اور پھر دونوں پارٹیوں کے بیانات لئے جاتے۔ گواہ پیش ہوتے۔ لڑائی کی اصل وجہ معلوم کی جاتی۔ اور جس کی زیادتی نظر آتی۔ جو فساد کی جڑ ثابت ہوتا۔ رحمٰن میاں اس کے باب میں بالکل رورعایت نہ کرتے۔ اور اس کا تو ایسا لتاڑا کرتے، ایسی تھکا فضیحتی کرتے کہ دیکھنے والوں کے لئے تازیانہ عبرت ثابت ہوتا۔ مگر بیچ میں دخل در معقولات کرنے کی جسارت کوئی نہ کرسکتا۔ کیونکہ سب رحمٰن میاں کے شیطانی غصہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ طیش کے عالم میں تو وہ بالکل ہی بھیڑیا بن جاتے۔ اس لئے سب لوگ جہاں ان کی عزت کرتے تھے وہاں دل ہی دل میں خائف بھی رہتے تھے۔ کبھی آنکھ ملانے کی کوشش نہ کرتے۔ کبھی اُن کی کسی بات کی تردید نہ کرتے۔ بس ہاں میں ہاں ملاتے جاتے چاہے بات دل کو لگے یا نہ لگے ـــــ لیکن ایک بات سب جانتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مانتے تھے کہ رحمٰن میاں نے محلّے کے سارے گندے عناصر کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اور وہ لونڈے جن میں دنیا جہاں کی برائیاں تھیں، جو

منشیات کے عادی تھے، جو آزادانہ وہ آنا کوٹھوں پر آتے جاتے تھے، اب محلّے کے بہترین رہبر ہیں۔ ہادی ہیں اور محلّے کی عزت کے محافظ ہیں۔ اس لحاظ سے رحمٰن میاں کا مشن کامیاب رہا تھا۔ جس کام کو پورا کرنے کا بیڑا انہوں نے اُٹھایا، اُس کو پورا کرکے ہی دم لیا۔ یہ کامیابی معمولی نہ تھی۔ اس کے بعد تو وہ مقبولِ عام ہو گئے۔ محلّے کے ہیرو بن گئے۔ ان کا نام زبانِ زدِ عام و خاص ہو گیا۔ عورت مرد بچّے بوڑھے سب ہی اُن کے مدّاح تھے۔ مشکلات اور پریشانیوں میں لوگ بے ساختہ انہیں آواز دیتے۔ یہ ناممکن تھا کہ محلّہ میں کوئی مشکل پیدا ہو جائے اور اس سلسلے میں اُن کا نام نہ آئے۔ اگر کوئی سبزی فروش کسی عورت سے زیادہ پیسے وصول کرنے کی کوشش کرتا یا اپنی لانبی زبان کا غلط استعمال کرتا تو وہ پولیس کی مدد نہیں لیتی بلکہ چھوٹتے ہی یہی کہتی کہ "رحمٰن میاں کو بلاؤں؟" جیسے وہ قاضی القضاۃ ہوں اور اس موقع پر اس سبزی فروش کی گھگھی بندھ جاتی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رحمٰن میاں کی آمد کے پس پشت کیا مقصد ہے؟ اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس کے جذبات کی تلخی فرو ہو جاتی اور الفاظ مصری کے شربت میں ڈوب کر اس کی زبان سے باہر نکلتے۔

رحمٰن میاں کی ذات امن و سکون کی ضامن تھی۔ وہ حقیقت میں سب کے لئے خضر بن گئے تھے۔ اُن کا دور امن و آشتی اور بے فکری کا دور تھا۔ لوگوں کے دلوں سے خوف دور ہو گئے تھے۔ محلّے کی لڑکیاں ہنسی خوشی آزادانہ اسکول جایا کرتی تھیں۔ اب ان کے پیچھے دوسرے محلّے کے شرارتی لونڈے نہیں آتے تھے۔ دو ایک رحمٰن میاں اور ان کی خفیہ پولیس کے ہاتھوں اس طرح پٹے تھے کہ لڑکیوں کا تعاقب تو دور کی بات ہے اگر کوئی ضروری کام بھی ہوتا تو بھی وہ اُس طرف کا رُخ نہ کرتے۔ اور پھر اب محلّے میں چوریاں بھی کم ہو گئی تھیں۔ شاید چوروں اور اٹھائی گیروں کو پتہ چل گیا تھا کہ اس محلّے کا نگرانِ اعلیٰ حجاج بن یوسف کی طرح جابر ہے۔ رات کو بہت دیر تک رحمٰن میاں کے کئی ساتھی محلّے کے کئی راؤنڈ لگاتے تھے۔ "جاگتے رہو" کے نعروں کی بجائے وہ "سوتے رہو" کے نعرے لگاتے تھے۔ شاید اس لئے کہ محلّے والوں کو معلوم ہو کہ دور دور تک خطرے کا

نام ونشان نہیں۔ سب اطمینان وطمانیت کی نیند ہو سکتے ہیں!

رحمٰن میاں کی ایک بہن تھی ـــــ فوزیہ ـــــ کم عمر بھی تھی اور خوبصورت بھی! مگر اُس کی عادتیں اور لچھن شریفانہ نہ تھے۔ حیا وغیرت تو جیسے اُس کو چھُو کر بھی نہیں گئی تھی۔ دیدوں کا پانی مر گیا تھا۔ اُس طرح اپنی ادائیں دکھاتی تھی جیسے جوانی صرف اُس پر آئی ہو۔ بڑی بوڑھیاں تو کنواریوں کو اس کا نام لینے سے روکتی تھیں۔ جیسے زبان پر اُس کا نام آیا اور شرافت پر داغ لگ گیا۔ توبہ توبہ! الامان!! وہ اتنی آزادی اور بیباکی سے مردوں سے باتیں کرتی تھی جیسے وہ اس کی جنس سے تعلق رکھتے ہوں یا اس کے لئے بالکل ہی بے ضرر ہوں۔ لوگوں کو حیرت تھی۔ جلاد صفت اور جابر بھائی کی ایسی بہن! سب حیران تھے کہ رحمٰن میاں اُس کے بڑھتے ہوئے قدم کیوں نہیں روکتے؟ اس پر پابندی کیوں نہیں عائد کرتے؟ ان مردوں کی گردنیں کیوں نہیں توڑ دیتے۔ جو اس سے اس طرح آزادی سے ملتے ہیں جیسے وہ ان کی داشتہ ہو!! مگر اس معاملہ میں رحمٰن میاں بالکل ہی خاموش اور بے تعلق تھے۔ جیسے وہ اُن کی بہن ہی نہ ہو۔ یا محلّے کی اصلاحات سے انہیں فرصت ہی نہ ملتی ہو کہ وہ اپنی بہن کی طرف توجہ کر سکیں یا کوئی اور وجہ ہو۔ وہ تو محلّے کی عزت کی حفاظت کے لئے فکرمند رہتے تھے۔ انہیں اپنی اور اپنے گھر والوں کی جیسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سوچتے رہتے کہ محلّے کی عزت خاک میں نہ مل جائے! کوئی بدمعاش یہاں کی کسی پھول جیسی کومل لڑکی کو نہ بگاڑ دے۔ کسی کی شرافت کو داغدار نہ کر دے۔ بہت سے لوگوں نے چاہا کہ وہ رحمٰن میاں کو سمجھائیں کہ وہ اپنی بہن کی طرف سے غافل نہ ہوں۔ اس کو اتنی ڈھیل نہ دیں کہ اُس کی وجہ سے خاندان کی ناک کٹ جائے۔ مگر اُن کے رعب اور دبدبے کی وجہ سے سب خاموش ہی رہے۔ وہ تو جنونی تھے۔ اگر اُن کے جنون کا رُخ سمجھانے والوں کی طرف ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر وہ شیر کے منہ میں ہاتھ نہ ڈال سکے۔

ایک دن شام کے وقت حسبِ معمول تازہ ترین حالات معلوم کرنے کے لئے رحمٰن میاں محلّے کا ایک چکّر لگا رہے تھے۔ دوسروں کے سلام کا اشارے سے جواب دیتے ہوئے جوں ہی وہ گلی کے نکڑ پر پہنچے تو بُری طرح چونک پڑے۔ ٹیلیفون کے پول کے پاس ایک

نوجوان مشکوک حالت میں کھڑا سگریٹ کے طویل کش لگا رہا تھا۔ محلّے کا ہر حصّہ اُن کا کھنگالا ہوا تھا۔ بچے بوڑھے سبھی کو وہ نہ صرف چہرے سے جانتے تھے بلکہ اُن کی فطرت سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ یہ نوجوان یقیناً اس محلّے کا نہ تھا۔ اور تب رحمٰن میاں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان کی چھڑی والا ہاتھ اضطراری طور پر زور زور سے ہلنے لگا۔ محلّے کی عزت خطرے میں تھی۔ پھر کسی کی عزّت غیر محفوظ تھی۔ پھر کسی کی ناک کٹنے والی تھی۔ اور یہ سب ان کے راج میں ہو رہا تھا۔ وہ کیسے اس چیز کے متحمل ہو سکتے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے اُس نوجوان کے پاس پہنچے۔ وہ ان کو اپنے قریب دیکھ کر بوکھلا گیا۔ سگریٹ انگلیوں سے گر گئی۔ چور پکڑا گیا تھا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ جیسے دو حریف مقابلے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اُن کا مقابل کمزور معلوم ہو رہا ہے۔ رحمٰن میاں کی خونخوار نگاہیں چاقو کی تیز دھار بن کے اُس کے دل میں چبھتی جا رہی تھیں۔ ان کا چہرہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا اور وہ نوجوان تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُن سے آنکھ ملانے کی جرأت جیسے اس میں نہ تھی۔ بس چپ چاپ گردن جھکائے اُس مجرم کی طرح کھڑا تھا جس کو عدالت نے قید بامشقت کی سزا دی ہو۔

"کیوں میاں! ادھر کیا کر رہے ہو" انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"جی —— جی —— میں ——"

"بکو جی! کیا جی جی کر رہے ہو" وہ دھاڑ کر ایک قدم آگے بڑھے۔

نوجوان کی ٹانگیں اس طرح کانپنے لگیں جیسے ان میں اسپرنگ لگا دیا گیا ہو۔ اور اُن کا جی چاہا کہ اُس نوجوان کی نکسیر ایک ہی گھونسہ میں پھوڑ دیں جس کا دل تو چوہے کی طرح ہے مگر جو بدمعاشی کرنے یہاں چلا آیا تھا، مگر انہوں نے بڑی مشکل سے ضبط سے کام لیا۔ ابھی حالات سے وہ ناواقف تھے۔

"جی —— مجھے —— اُس نے بلایا ہے"

"کس نے؟ —— آگے بھی چلو" ان کا لہجہ فولاد کی طرح وزنی تھا۔ "محلّے کی عزّت خطرے میں ہے!" ہر طرف سے اُن کے کانوں میں یہی آوازیں آ رہی تھیں۔

"فوزیہ نے ——— !" وہ مرتعش لہجے میں بولا۔ اور جیسے رحمن میاں کے غصّہ کی آگ پر کسی نے برف کا پانی ڈال دیا ہو۔ چہرے کی ساری سختی معدوم ہو گئی۔ شرمندگی اور خجالت کے احساس سے وہ زمین میں دبے جا رہے تھے۔ اُس میزبان کی طرح جس نے غلطی میں اپنے عزیز مہمان کی توہین کر دی ہو!

"اوہ! معاف کیجیے" وہ خوش اخلاقی سے بولے "مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ کیا گھر چلیں گے یا میں فوزیہ کو بلاؤں؟"

"نہیں! وہ خود چند منٹوں بعد یہیں آئے گی" نوجوان کی جان میں جان آئی۔ اور رحمن میاں اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اُن کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ دل کو سکون مل گیا تھا، کیونکہ محلّے کی عزّت خطرے میں نہیں تھی!!
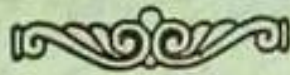
نیا قرضہ

جوں ہی ارمان صحرائی کا جنازہ اُٹھا آسمان پر چھائے ہوئے کفن جیسے سفید بادلوں کی آنکھوں سے اس طرح ہلکے ہلکے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے جیسے وہ بھی اس کی مرگِ مفاجات پر اشکبار ہوں۔ اس کی موت پر سوگوار ہوں۔ صحرائی نہ لیڈر تھا نہ ملک التجار اور نہ ہی کسی مِل کا مالک کہ اس کے جنازے کے پیچھے نئی نئی چمکدار کاروں کی قطاریں ہوتیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہوتے۔ وہ تو ایک شاعرِ آتش نوا تھا جو دوسروں کے گریبان سینے کی فکر میں خود زندگی کی حقیقی مسرتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ جنازے میں شریک ہونے والوں کی تعداد معدودے چند تھی۔ اتنے تھوڑے کہ آسانی سے انگلیوں پر گِنے جا سکتے تھے ۔۔ دو چار پڑوسی تھے جو سرکاری تعطیل ہونے کی وجہ سے آگئے تھے ورنہ تعداد میں سے انہیں بھی منہا کرنا پڑتا۔ ایک دو رسالوں کے مدیر تھے جن کو یہ فخر حاصل تھا کہ صحرائی کا بہترین کلام ان کے جرائد میں چھپتا تھا اور مرحوم کے چند جانثار احباب جو صحرائی کی زندگی میں اُس کے شانہ بشانہ چلتے تھے۔ ادبی محفلوں میں اس کے کلام سے محظوظ ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر سستی شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے غمِ دہر کے احساس کو فراموش کرتے تھے اور مشاعروں میں دل کھول کر اس کے ہر شعر پر داد دیتے تھے ـــــ سب کے جسم مدقوق تھے۔ آنکھوں میں زردیاں گھوم رہی تھیں۔ گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا جیسے مُردے جنازے کو کندھا دے رہے تھے۔ ان کے چہروں سے تکلیف کا احساس یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے جنازے کا بوجھ اُن کے کندھوں پر پڑتا ہوا اُن کی روح کے پاتال میں دھنستا جا رہا ہو!۔

جیسے ہی جنازہ گھر سے نکلا یادل اس زور سے گرجا کہ سب کے چہروں کی زردیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس خوفناک گرج کے بعد چند ثانیوں کے لئے فضا خاموش رہی جیسے طوفان آنے سے پہلے ساحل پر دور دور تک سناٹا پھیل جاتا ہے ـــــ اور پھر رضیہ کی درد بھری طویل چیخ کی بازگشت فضا کو اُداس کرتی ہوئی حاضرین کے دلوں میں افسردگی بن کر اتر گئی۔ اس وقت اس کی صورت خوفناک پاگلوں سے زیادہ خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔ چوڑیوں کے ٹوٹنے سے اس کی کلائیوں پر خون کی ننھی ننھی بوندیں اس کے اپنے دل کی دھڑکنوں کی طرح لرز رہی تھیں۔ کپڑے کئی جگہوں سے پھٹ گئے تھے۔ مگر اسے تو جیسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ اس شدّ و مد سے سینہ کوبی کر رہی تھی، دو ہتّھڑ چلا رہی تھی کہ عورتوں کے سامنے محرّم کی دسویں تاریخ کے ماتم کا نقشہ پھر گیا۔ یہ منظر دیکھ کر کچھ کمزور دل عورتیں دہل گئیں۔ کچھ کو جھوٹے منھ تسلّی دینے کا بھی ہوش نہ رہا۔ مگر کچھ سمجھ دار، جہاندیدہ خواتین نے آگے بڑھ کر اس کو تسلّیاں دیں۔ آہستہ سے سمجھایا۔ قدرت کے قوانین کا خاکہ اس کے سامنے کھینچ دیا۔ دنیا کے فانی ہونے کے سلسلے میں مثالیں دیں اور صبر کی تلقین کی۔ مگر اس سے اُس کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ نہ بجھ سکی۔ اس کی آنکھوں سے بہتا ہوا پانی نہ رک سکا۔ اپنی ماں کی یہ ظاہری حالت دیکھ کر اس کے دونوں کمسن بچے سہم کر بری طرح چیخنے لگے۔ وہ اتنے ذی ہوش نہ تھے کہ اپنے باپ کی موت کے غم کا انہیں احساس ہوتا۔ وہ تو بُری طرح خوفزدہ تھے اور ڈر کے سبب کانپ رہے تھے۔ پڑوس کی ایک عورت کو ان بیچاروں پر رحم آگیا۔ اس نے فوراً انہیں وہاں سے ہٹایا اور اپنے گھر لے آئی۔ اپنے بچوں کو اُن کے ساتھ کھیلنے کی ہدایت کی۔ ان کے سامنے کھلونوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ ان کا خوف کم تو ہوا مگر معدوم نہ ہو سکا۔ وہ بار بار یہی پوچھتے رہے۔

"میری امّی کو کیا ہوا؟"

"ابّا کو لوگ کہاں لے گئے؟"

ان باتوں کا بھلا پڑوسن کے پاس کیا جواب تھا۔

صحرائی کی موت کا نہ صرف اس کے گھر والوں بلکہ سارے محلّے کو غم تھا۔ سب حیران تھے کہ

اب اس مختصر سے خاندان کا کیا ہوگا؟ مرحوم کی زندگی ہی میں ان کے سروں پر پریشانی اور دکھوں کا سایہ تھا۔ معاشی بدحالی نے اُن کی چول چول ڈھیلی کر دی تھی اور دو وقتوں کی روٹی کا حاصل کرنا ان کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔۔۔۔۔۔

صحرائی کوئی اعلیٰ سرکاری آفیسر تو تھا نہیں کہ اس کی موت کے بعد اس کے لواحقین عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے! وہ تو ایک شاعر تھا اور شاعری سے ذہن اور دل کی آگ تو بجھ سکتی ہے مگر پیٹ کی آگ نہیں! اور پھر صحرائی بلانوش بھی تھا۔ شراب کے بغیر تو وہ مطلع بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ جس طرح لوگ شراب پی کر ہوش کھو دیتے ہیں اسی طرح اس کا ذہنی توازن شراب کے نہ پینے سے بگڑ جاتا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی تھیں اور وہ خود کو دنیا کا سب سے زیادہ کندہ ناتراش اور جاہلِ مطلق محسوس کرنے لگتا۔ مگر جوں ہی وہ ایک پیگ چڑھا لیتا اس کے حواس بحال ہو جاتے۔ اس کی آنکھوں میں غزل کا حسن پھیل جاتا۔ نظموں کی رنگینی بکھر جاتی ــــــ ستاروں سے زیادہ چمکدار خیالات اور کنواری دوشیزاؤں کی انگڑائیوں سے زیادہ حسین تصورات اس کے ذہن میں یوں کروٹیں بدلنے لگتے جیسے کوئی حسینہ نیند نہ آنے کے سبب یا کسی کی یاد میں بے چین ہو کر بستر پر کروٹیں بدلنے لگتی ہے۔ وہ قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ اسے اپنی تخلیق کا جو کچھ معاوضہ ملتا اس میں سے آدھی کی شراب پی لیتا اور جو کچھ بچتا وہ بیوی کے حوالے کر دیتا۔

اسی طرح ان کی زندگی تکلیفوں کو اپنے کندھوں پر لئے آگے بڑھتی گئی۔ شب و روز گزرتے گئے۔ اگر کچھ دنوں کے بعد کسی مجبوری کے سبب کوئی چیز تیار نہ ہو سکتی تو گھر میں آگ نہ جل سکتی اور اس کو کسی قرض خواہ کی تلاش میں جوتیاں چٹخانا پڑتیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ مرا تو اس کا بال بال قرض میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے کفن کے لئے بھی پیسے نہ چھوڑے تھے جس کے نتیجہ میں اس کی تدفین قریبی مسجد کی کمیٹی کی زیرِ نگرانی ہوئی ــــــ شاید اسی لئے محلّے والے حیران تھے کہ اب کس طرح رضیہ زندگی کی راہوں پر چل سکے گی جبکہ اس کا وہ آخری سہارا بھی چھن گیا تھا جو خود دوسروں کے سہاروں کا محتاج تھا!!

صحرائی کی موت کے بعد تین روز تک محلّے والے حاضری بھیجتے رہے اور یہی تین دن

اُن کی زندگی کے سب سے زیادہ سکون بخش اور طمانیت آگیں دن تھے۔ اُن کے ذہن فکروں سے بے نیاز تھے۔ کھانا دیکھتے ہی دونوں معصوم بچے ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے بھوکے گِدھوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ رضیہ بھی بھلا کب تک بھوکی رہ سکتی تھی۔ مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے؟ اب اُس کی گمشدہ بھوک بھی لوٹ آئی تھی۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بغیر ہاتھ دھوئے ہی کھانے کے پاس بیٹھ جاتی کیونکہ دونوں بچوں کی رفتار بہت ہی تیز ہوتی —— کھانے کے دوران وہ تو بت کی طرح خاموش رہتی مگر دونوں بچے خوب چہکا کرتے۔

"کتنے مزے کا سالن ہے بھیا!!"

وہ دونوں مزے لے لے کر کھاتے رہتے مگر رضیہ کا ذہن خیالوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ مستقبل کی تاریکیوں میں اس کا دل بھٹکنے لگتا۔ وہ اُن دنوں کے متعلق سوچنے لگتی جب یہ نعمتِ غیر مترقبہ نظروں سے اوجھل ہو کر خواب ہو جائے گی۔ جب زندگی کی کڑی دھوپ سے بچنے کے لئے انہیں چھاؤں کی ضرورت ہوگی اور چھاؤں کا کوسوں دور پتہ نہ ہوگا—وہ سوچتی اور اپنے ہی پیدا کردہ اذیّت ناک خیالوں کے ساگر میں ڈوب جاتی۔

تین دنوں بعد جب حاضری آنی بند ہو گئی تو رضیہ نے اپنی رسوئی میں بکھرے ہوئے بن ڈھکنوں کے ٹوٹے ہوئے ڈبّوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی دال، کچھ بدبودار آٹا اور چند پلپلے آلو رہ گئے تھے۔ کھانا تیار ہونے کے بعد جب اُس نے دونوں بچوں کو بلایا تو چھوٹے بچّے نے بُرا سا منھ بنا کر کہا۔

"میں یہ سڑی ہوئی دال نہیں کھاؤں گا"

"امّاں! آج پڑوسیوں نے کھانا کیوں نہیں بھیجا؟" بڑے نے بڑی معصومیت سے پوچھا اور اس لمحہ آنسوؤں کے چند قطرے اس کی آنکھوں کی چلمن کو نم کرنے لگے۔ وہ بچوں کو سمجھا نہ سکی کہ آدمی کے مرنے کے بعد حاضری آتی ہے ارمانوں کی موت کے بعد نہیں!! —— اور پھر اسی لمحے دروازے پر شدّ و مد سے دستک ہونے لگی اور دونوں بچے تھان سے بھاگے ہوئے اڑیل گھوڑے کی طرح اُچھل کر باہر بھاگے مگر چند لمحوں بعد دونوں منھ لٹکائے واپس آ گئے۔

"اماں! ان کے ہاتھ میں تو کوئی خوان نہیں"۔ چھوٹے بچے نے کہا۔

"کون ہیں؟"

"مجھے نہیں پتہ! عجیب سی باتیں پوچھ رہے ہیں"۔

"جاؤ انہیں بیٹھک میں بٹھاؤ"۔

چند لمحوں بعد اس نے دروازے کی آڑ سے کمرے میں جھانکا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی عقابی نگاہوں سے کمرے کی ہر شئے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی شیروانی کے آدھے سے زیادہ بٹن کھلے ہوئے تھے۔ پان کی پیک سے ہونٹ گلنار تھے اور بالوں کو دیکھ کر تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس کے سر پر کسی نے چیل کا گھونسلہ اٹھا کر رکھ دیا ہو۔ دروازے پر آہٹ سن کر وہ پہلے تو چونکا اور پھر زوردار آواز میں بولا۔

"السلام علیکم"

"آداب!" رضیہ نے دھیمے لہجے میں کہا "کون صاحب ہیں؟"

"جی خاکسار کو مہتاب احمر کہتے ہیں۔ میں یہاں کے ایک ماہانہ ادبی جریدہ "تعمیر" کا مدیر اعلیٰ ہوں جس کی ماہانہ اشاعت ہندو پاک کے سب ادبی رسالوں سے زیادہ ہے۔ الحمد للہ ـــــــ" اس نے ایک ہی سانس میں بغیر رکے ہی سب کچھ کہہ ڈالا۔ مدیر کا نام سُن کر رضیہ کے دل میں امید کی کرن جگمگا اٹھی۔ گھر میں ایک پائی نہ تھی۔ صرف اللہ کا نام تھا۔ اُس نے سوچا کہ شاید وہ صحرائی کی کسی مطبوعہ غزل کا معاوضہ دینے آیا ہے۔

"کس غرض سے آئے ہیں جناب؟"

"جی بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے ماہ صحرائی مرحوم، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، مجھ سے یہ کہہ کر سو روپے لے گئے تھے کہ وہ کچھ دنوں بعد ایک غزل مرحمت فرمائیں گے مگر شومئی قسمت سے اُن کا انتقال ہو گیا اور وہ غزل حسبِ وعدہ نہ دے سکے۔ اگر آپ وہ سو روپے واپس کر دیں تو عین نوازش ہو گی"۔ واپسی کا نام سن کر رضیہ کی اُمید بھاپ کی مانند بھک سے اڑ گئی۔ اس کا دل درد و غم کی گہرائی میں ڈوب گیا۔

"دیکھئے اِن دنوں ہم پریشان ہیں۔ چند روز بعد آپ کی رقم واپس کر دی جائے گی" اس

نے کہنے کو یہ بات بوجھل اور تھکی ہوئی آواز میں کہہ دی مگر اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسا موقعہ کبھی نہیں آئے گا۔

"ارے یہ کیا؟" احمر تقریباً اُچھل پڑا۔ "واللہ کچھ نہ پوچھیئے۔ اس وقت میں خود کو کتنا خوش نصیب تصوّر کر رہا ہوں۔ دیکھیئے یہ غزل مجھے ایک کتاب میں رکھی ہوئی ملی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ یہ مرحوم کی غیر مطبوعہ غزل ہے۔ اُن کے کلام کا کوئی سرا مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ارے غزل کا مطلع تو ملاحظہ فرمائیں۔ کیا خیال باندھا ہے واہ وا ــــ "موت اچھی نہ زندگی اچھی" ــــ یہ خیال تو صحرائی مرحوم کی بے چین فطرت کا آئینہ دار ہے۔ واقعی ان کی نگاہ میں زندگی و موت کی کوئی وقعت نہ تھی۔ قاری کو دو آتشہ کا مزہ آجائے گا۔ اچھا محترمہ! میں اجازت چاہتا ہوں۔ خدا آپ کو . . . ــــ"

اور وہ چلا گیا۔ رضیہ نے بے بسی سے کمرے کی ہر شئے کو دیکھا۔ دونوں بچّے حیرت سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے تھے امی؟" چھوٹے بچّے نے اُلّوؤں کی طرح دیدے نچا کر پوچھا۔

"ارے یہ بھی نہیں جانتا!" بڑے نے اس کو سمجھایا۔ "یہ غزل کہہ رہے تھے۔ یہ بھی تو ابا کی طرح شاعر ہیں۔"

"اچھا!"

دونوں بچّے غزل کی ابجد سے واقف نہ ہوتے ہوئے بھی غزل پر بحث کر رہے تھے۔ مگر اس کا دُکھا ہوا دل مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ اپنی ناکام حسرتوں اور اُمیدوں کا مرثیہ! اور پھر جب شام کے وقت سورج ڈوبنے کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا دل بھی آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا تو صحرائی کا ایک اور دوست آگیا۔ یہ ایک خوش شکل اور خوش لباس شخص تھا۔ چہرے کے دل کش خطوط نے اس کی شخصیت کو وجیہہ اور بارعب بنا دیا تھا۔ اس نے آتے ہی دونوں بچوں کو پیار کیا اور آدھے گھنٹے تک مرحوم کی صفات اور خوبیوں پر لیکچر دیتا رہا۔

"موت!" وہ گمبھیر لہجہ میں بولا۔ "موت سے کسی کو مفر نہیں مگر صحرائی نے موت کے

لبوں کو چوم کر زندگی کے ایک نئے راستے پر قدم رکھا ہے جو فنا کی طرف نہیں بقا کی طرف طرف جاتا ہے۔" اس کی باتوں نے رضیہ کے مرجھائے ہوئے امید کے پھول کو پھر سے کھلا دیا۔ اِس آدمی کو صحرائی سے کتنی والہانہ عقیدت ہے۔ اس کے بچوں سے پیار ہے۔ اس کی بیوی سے ہمدردی ہے۔ یقیناً اُس کو اُن کی زبوں حالی کا بھی علم ہوگا مگر سوال یہ تھا کہ وہ کس طرح اپنے احتیاج کا دامن اُس کے سامنے پھیلائے؟ شرم مانع تھی۔ اس کے سامنے کہنا چاہتے ہوئے بھی وہ نہ کہہ سکی کیونکہ اس نے ایک نئی بات ہی چھیڑ دی تھی۔

"مگر یہ قوم ـــــــ" اس کی آواز میں زہر تھا" یہ قوم اپنے ہیرو کی پرستش تو کرنا جانتی ہے مگر اُس کے دُکھوں کو بانٹنا نہیں! زندگی نے صحرائی کو صرف غم دیا۔ پریشانیاں دیں۔ مرنے سے چند روز پہلے انہوں نے مجھ سے دو سو روپے۔۔۔۔" اور اس کے آگے وہ کچھ نہ سن سکی۔ اس کو بخوبی علم تھا کہ وہ کیا کہے گا؟ کیا مانگے گا؟ وہ چیز جو اس کی دسترس میں نہیں۔ اُمید کے دامن کے چیتھڑے اس کی نگاہوں کے سامنے جھول رہے تھے۔ اس نے مردہ آواز میں اس کی رقم کی مستقبل میں ادائیگی کا وعدہ کیا۔

"نہیں نہیں!" وہ چلا اٹھا" لِلّٰہ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں یہاں پیسے واپس لینے نہیں آیا۔ میں نے تو بر سبیل تذکرہ کہہ دیا تھا۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ ہاں یہ چند کتابیں ساتھ لے جا رہا ہوں۔ پڑھ کر واپس کر دوں گا۔" رضیہ نے دروازے کی آڑ سے دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں صحرائی کی چھوٹی سی لائبریری کی چند موٹی موٹی اہم کتابیں تھیں اور وہ بڑی مشکل سے انہیں سنبھال رہا تھا۔ اس نے غم میں لپٹی ہوئی ایک طویل آہ بھری۔ وہ جانتی تھی کہ کتابوں کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ جانے کے بعد بھی چیز واپس ہوتی ہے!

اُس رات اُن کو بھوکے ہی سونا پڑا۔ زندگی کی کٹھنائی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پریشانی مستقل طور پر گلے کا ہار ہو چکی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو چھوٹا بچہ بُری طرح چیخ رہا تھا:

"اماں! ماں جی!"

"کیا ہوا بیٹے؟"

"مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔"

"ابھی ٹھیک ہو جائے گا بیٹا!"

"کوئی چیز گھوم رہی ہے۔" اُس کی آنکھوں کے حلقے تاریک نظر آ رہے تھے چہرے پر مُردنی چھا گئی تھی۔ اتنے میں دروازہ زوروں سے کھٹکھٹایا گیا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے چونکی مگر فوراً سنبھل گئی۔ اس کو معلوم تھا کہ حاجت روا کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ دروازے پر دو تین آدمی اس کے منتظر تھے۔ سب کے چہروں پر غصّہ اچھل کود رہا تھا — ایک نئی مصیبت کی آمد آمد تھی۔

"اخبار کے پچھلے تین مہینوں کا حساب دو جی!"

"دودھ کے ایک سو تیس روپے۔"

"اور میرے ڈیڑھ سو روپے —"

اس نے بڑی مشکل سے اس طوفان کو رُکا جھوٹے وعدے اُن کو مطمئن تو نہ کر سکے مگر نہ جانے وہ کیا سوچ کر وہاں سے چلے گئے — مگر یہ آخری طوفان نہ تھا۔ زندگی کے غموں کا بوجھ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ بچّے بھوک سے تڑپ رہے تھے۔ اس نے چادر سر پر ڈالی اور قریب کی دکان کی طرف چل دی۔ اس اُمید پر کہ شائد پرانی جان پہچان کو ملحوظ رکھ کر دکاندار پھر کچھ چیزیں ادھار دے دے گا مگر یہاں بھی اُسے ٹکا سا جواب ملا۔

"پہلے پچھلا حساب بیباق کرو۔"

اور وہ نا امیدی کو سینے سے لگائے گھر کی طرف مڑی تو اُس نے دکاندار کی آواز سنی جو کسی سے کہہ رہا تھا۔

"یہ ہے شاعر کی بیوی! خود تو سالا مزے سے قبر میں سو گیا... —" اس نے کچھ اور کہا اور پھر صحرائی کی روح کے ایصالِ ثواب کے لئے ایک موٹی سی گالی دے دی۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس نے بیٹھک میں کسی کی آواز سنی۔ جھانک کر دیکھا تو ایک آدمی کو بیٹھے دیکھا جس کے بڑے بڑے بے ترتیب بال گدّی تک آ گئے تھے۔ مگر لباس صاف ستھرا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بڑے لڑکے

سے باتیں کر رہا تھا۔ چھوٹا بچہ پہلے تو اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اچانک بول اٹھا۔

"کیا آپ مجھے ایک روپیہ دے سکتے ہیں؟"

ایک لمحے کے لئے اس آدمی کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے اور اُسی لمحے رضیہ کا دل چاہا کہ اپنے سینے میں چاقو اتار لے۔ شرم کے جذبات سے اس کا چہرہ بھیگ گیا۔

"کیا کرو گے ایک روپیہ لے کر؟"

"چنے خریدوں گا۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"تمہیں چنے بہت پسند ہیں؟"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ "رات سے ہم نے کچھ نہیں کھایا۔"

اور رضیہ وہاں نہ ٹھہر سکی۔ اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ شرم و خفت کے جذبات نے بھوک سے زیادہ اس کے جسم پر منفی اثر ڈالا تھا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ وہ گندے فرش پر بچھی ہوئی پھٹی پرانی دری پر چت لیٹ گئی —— اس کی نظریں کھڑکی سے باہر آسمان پر تھیں۔ آج آسمان کا حُسن کچھ زیادہ ہی نکھرا ہوا تھا۔ بادلوں سے خالی نیلے آسمان کی کھلی فضا میں پرندے نامعلوم منزلوں کی طرف اُڑ رہے تھے۔ موسم کی رنگینی نے جیسے اس کی پریشانیوں کو اچانک دوچند کر دیا ہو۔ اُس کا ذہن اندھا کنواں بن گیا تھا کہ جس میں اُس کے بے ترتیب خیالات چکراتے ہوئے ڈوب رہے تھے!

کچھ دیر بعد دونوں بچے اس کے پاس آئے۔

"وہ چلے گئے اماں!"

"یہ صاحب کیا لے گئے؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" بڑے لڑکے نے کہا۔ "یہ دے گئے ہیں!"

اُس نے ایک لفافہ اپنی ماں کو دے دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ لفافہ سر بمہر تھا اور کھلتے ہی ایک سو روپیہ کا نوٹ اس کے ہاتھ میں آ گیا اور ساتھ ہی تہہ کیا ہوا ایک کاغذ!

"میں تو اپنا قرض وصول کرنے آیا تھا مگر کچھ دے کر جا رہا ہوں — یہ احسان نہیں بلکہ یہ بھی قرض ہی ہے۔ مگر اس کی ادائیگی آپ پر واجب نہیں۔ میں اپنا سارا قرض اکٹھے ہی صحرائی کی روح سے وصول کر لوں گا۔"

کاغذ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ یہ چوٹ کچھ زیادہ شدید اور تکلیف دہ تھی۔ خط کے الفاظ جیسے اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ سو روپے کا نوٹ قریب ہی دری پر پڑا ہوا تھا اور وہ اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے یوں ڈر رہی تھی جیسے چھوتے ہی وہ سانپ بن کر ڈس لے گا!!

"اماں! خلیفہ جی کے ہوٹل سے تنّور کی روٹی اور نہاری لاؤں؟" بڑے لڑکے نے پوچھا۔ چھوٹے نے نہاری کے نام پر زبان ہونٹوں پر پھیرنا شروع کر دی۔ وہ خاموش رہی۔ صرف اثبات میں گردن ہلا دی۔ اُس وقت وہ ان دنوں کے متعلق سوچ رہی تھی جب سو روپے بھی خرچ ہو جائیں گے۔ پھر کیا ہو گا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا!!
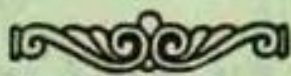
رہائی

گیارہ سال پہلے جب گلاب خاں ہتھکڑی پہنے دو پولیس والوں کی معیت میں سر جھکائے، بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے کچّی اور ناہموار سڑک سے گزر کر جیل کی نیم تاریک، کثیف اور حشرات الارض سے بھری ہوئی گھٹن آلود کوٹھری کی طرف بڑھ رہا تھا تو گارڈن میں کام کرنے والے قیدی اس کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ ان کے چہروں پر حیرت کی آڑی ترچھی لہریں اس طرح پھیل گئی تھیں جیسے انھوں نے انسانوں کے اژدہام میں کسی عفریت کو دیکھ لیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی کوئی کدال چھوڑ کر دونوں ہاتھوں کی مٹی جھٹکتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ کسی نے خواہ مخواہ اپنے شانوں کو جنبش دی اور کوئی غیر شعوری طور پر اپنے دو ہونٹوں کو ملاتے ہوئے سیٹی بجانے لگا۔ مگر جونہی انہوں نے نگران کانسٹیبل کو سگریٹ کے دھوئیں کے چھلّے بناتے ہوئے ٹوٹی ہوئی دیوار کے عقب سے نمودار ہوتے دیکھا تو بے ترتیب صفوں میں ابتری پھیل گئی۔ کسی نے کدال اٹھالیا۔ کسی نے کھرپا اٹھالیا۔ کوئی جلدی سے درختوں کو پانی دینے لگا۔ ان کے ہاتھ کام میں مشغول تھے۔ دماغ نئے خیالوں کے تار و پود کو یکجا کر رہے تھے اور آنکھیں چوری چوری اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔

گلاب خاں سرخ گلاب سے زیادہ سرخ تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے خون میں گہرے سرخ رنگ اور شفق کے ایک حصّہ کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کی طرف متوجہ نہ تھا مگر اس کے باوجود وہ بے حد بھیانک معلوم ہو رہی تھیں۔ کٹورے جیسی بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے کی مناسبت

سے بالکل موزوں تھیں۔ ان میں کوندے لپک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ مسلسل تین دن تین رات چرس بھری ہوئی سلفی کے طویل کش لیتا رہا ہو۔ اِس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کمر میں ہلکا سا خم تھا۔ مگر اس کے باوجود اُس کے اِرد گرد بکھرے ہوئے لوگ اس کے سامنے بونے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے پیر ننگے تھے۔ قمیض کے بٹن کھلے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے ہر ایک اس کے سینہ پر بکھرے ہوئے بالوں کے جال کو دیکھ سکتا تھا۔ گردن میں پڑی ہوئی تعویز اس وقت اُس کے بالوں میں یُوں اُلجھی ہوئی تھی جیسے کوئی مینڈک گھاس میں اِدھر اُدھر آہستہ آہستہ رینگ رہا ہو۔ گالوں پر داڑھی نہ تھی مگر ٹھوڑی پر چھ انچ لمبی داڑھی تھی جس کا تین چوتھائی حصّہ سفید ہو چکا تھا مگر سر کے خشک اور اُلجھے ہوئے بال جو گدّی سے بھی نیچے آ گئے تھے، بالکل سیاہ اور چمکدار تھے۔

دو دن تک کسی نے اس سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ بس چپ چاپ، چور نظروں سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگتے۔ کسی میں اس کو چھیڑنے کی ہمت نہ تھی جیسے وہ شہد کی مکھیوں کا چھتّہ تھا۔ اس کی صورت کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ بادی النظر میں دیکھنے والے کا دل ہل جاتا تھا۔ اس کی آمد سے پہلے سارے قیدی موقعہ ملتے ہی ہنسی مذاق کرتے تھے۔ کام چھوڑ کر اپنے جرائم کو بڑھا چڑھا کر اس طرح بیان کرتے تھے جیسے ایسا کرنے سے ان کی عزت و توقیر دوچند ہو جائے گی اور حکومت کی طرف سے کوئی طلائی تمغہ ان کی عظیم خدمات اور بہادرانہ کارناموں کے سلسلے میں ان کو حاصل ہوگا۔ مگر اب وہ مہر بہ لب ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی زبانوں پر قفلِ سکوت لگ گیا تھا۔ فضا پر جمود سا طاری ہو گیا تھا۔ کبھی وہ ان سے ذرا دور رہتا تو وہ کانا پھوسی شروع کر دیتے۔

"معلوم ہوتا ہے دو تین کو قتل کر کے یہاں آیا ہے۔" ہسٹری شیٹر چھٹّن کھرپے کر دستے کو دیکھتے ہوئی قیاس آرائی کرتا۔

"توبہ! توبہ! کتنا خطرناک ہے۔ دیو معلوم ہوتا ہے۔" مشہور گرہ کٹ بتّو دیدے گھما کر کہتا۔ "اگر مجھے معلوم ہو کہ اس کے پاس دس ہزار روپے ہیں تو بھی اس پر ہاتھ نہ ڈالوں۔ یہ تو

ٹریس کرنے والوں کا ٹیٹو دبا دیتا ہوگا۔"

"ارے اس طرف مت دیکھو۔ اس نے دیکھ لیا تو مصیبت آجائے گی۔" چرس فروشی کے جرم میں سزا پانے والا ملیاری دھوتی کو سنبھالتے ہوئے کہتا۔

"معلوم ہوتا ہے گونگا ہے۔ ابھی تک اس نے کوئی بات ہی نہیں کی۔"

"ارے تو کیا جانے! خطرناک مجرم خاموش ہی رہتے ہیں۔"

اور پھر دوسرے دن جب کام کا وقت ختم ہوگیا۔ گھنٹی کی تیز آواز فضا میں معدوم ہوگئی تو وہ سب حوض کے پاس منہ ہاتھ دھونے لگے۔ دن بھر مٹی اور دھول میں کام کرنے کی وجہ سے ان کے حلیئے ہی بدل گئے تھے۔ گردن اور ہاتھوں پر نمک کی سفیدی نمودار ہوگئی تھی۔ اور تب عین اس لمحہ چھٹّن نے سر اٹھا کر آہستہ سے کہا۔

"آج میں اس سے بات کروں گا۔"

"ک... کیا..." ملیاری کی گھگھی بندھ گئی۔ "تم ابھی ایسا نہیں کر سکتے۔ جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو تم اس سے جی بھر کر باتیں کرنا۔"

"ابے! تُو تو چوہے کی جان رکھتا ہے۔" کہنے کو تو بتو نے یہ بات کہہ دی مگر اندر ہی اندر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

"ابے تم کیا جانو! مانا ہوا استاد معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس سے دو چار گر سیکھ لوں۔" چھٹّن بولا۔ "اس کو تو دیکھ کر ہی میں نے گورو مان لیا تھا۔"

"کمر پر ہاتھ رکھ کر رؤ و گے۔" ایک نے کہا۔

اور پھر گندی پلیٹوں میں رات کا کھانا بٹنے لگا۔ بس نام ہی کا کھانا تھا ورنہ شاید کتے کا راتب اس سے کہیں زیادہ با ذائقہ اور مزیدار تھا۔ مگر بھوکے پیٹوں کو اچھے بُرے کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ وہ صرف شکم کی آگ کو فرو کرنا چاہتے ہیں۔ سارے قیدی اس طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے جس طرح بھوکے گدھ جنگل میں کسی انسانی لاش کو دیکھ کر جھپٹ پڑتے ہیں۔ سب کھا پی کر ڈکاریں لے چکے تو ان کو کمروں میں ڈھور ڈنگروں کی طرح بھر دیا گیا! ہر کمرے میں ایک ٹمٹماتا ہوا دیا تھا جس کی بے بضاعت روشنی کمرے کی تاریکیوں کو تو کیا مٹاتی بس دل کو

دہلانے اور ڈرانے کا سامان بن گئی تھی۔ جس کمرے میں گلاب خاں تھا اُس کی موجودگی نے کمزور دل قیدیوں کے لئے ایک مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ وہ بیچارے مُردے کی طرح بے سُدھ پڑے تھے۔ ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس کی شعلہ بار نگاہوں میں رقصاں سحر وافسوں کے دائروں کو بہ نظر غائر دیکھ سکتے۔ دو دن سے کمرے کی فضا بوجھل بوجھل، خاموش تھی۔ ہر ایک دوسرے کی سانس کی آوازیں باآسانی سن رہا تھا۔ وہ ہنسی مذاق نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ وہ سب تقدیر کے ظالم دیوتا کی طرح چپ چاپ تھے جو مظلوموں کی فریاد پر بھی مہر بہ لب رہتا ہے مگر آج چھٹّن نے ہمت کر کے اس سناٹے کو توڑ ہی دیا۔

"میں نے کہا۔۔۔" وہ کھنکارا اور گلاب خاں کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ ملباری نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روکا۔ ایک اور قیدی نے ہاتھ جوڑ کر اس کو باز رکھنے کی کوشش کی مگر اس نے گلاب خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ ہی دیا۔ وہ اس بُری طرح چونکا جیسے اس کو گہری نیند سے لات مار کر بیدار کر دیا گیا تھا۔ اس نے ایک نظر چھٹّن کو دیکھا۔ اس کا جسم ہلکے سے لرزا۔ اس سے پہلے کہ وہ گڑ بڑا کر اپنی آنکھیں جھکا لیتا گلاب خاں کی نظریں از خود زمین بوس ہو گئیں۔

"خاں صاحب!" اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔ "یہاں کیسے کیا آنا ہوا؟" گلاب خاں ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا۔ سب کی سانسیں بے ترتیب ہو گئیں۔ سانسوں کی آوازیں سنگیت کی ایک نئی دھن بن گئیں اور سب کے ذہنوں میں آنے والے واقعہ کا عکس لہرانے لگا۔

"سزا کاٹنے آیا ہوں"۔ گلاب خاں کا لہجہ عام پٹھانوں کی طرح بے ربط اور غیر مربوط نہ تھا۔ اس کی آواز بالکل دھیمی تھی۔ اگر اس کی یہ آواز پس پردہ نمودار ہوتی تو سامعین یہی سمجھتے کہ بولنے والا کوئی چمرخ سا ہوگا۔ چھٹّن کھوکھلی ہنسی ہنسا۔

"خاں صاحب! یہاں تو ہر ایک اسی لئے آتا ہے۔ خیر۔۔۔۔ شاید آپ بتانا نہیں چاہتے۔ کوئی بات نہیں اپنا نام ہی بتا دیجئے۔"

"میں نے تمہارا نام تو نہیں پوچھا"۔ اس کا لہجہ گمبھیر اور سنجیدگی کا حامل تھا۔

"میں نے تو دوستانہ طور پر یہ سوال کیا تھا"۔ چھٹّن نے صفائی پیش کی۔ مگر دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس دیوزاد کا ہاتھ نہ اس کی جانب اُٹھ جائے۔ اب اس کا ہاتھ اس

کے کندھے سے ہٹ چکا تھا اور وہ خود بھی ایک قدم پیچھے تھا۔

"یہاں ہم سب سزا کاٹنے آئے ہیں۔ دوستی بڑھانے نہیں"۔ گلاب خاں کا چہرہ اس وقت نیم تاریکی میں بے حد بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔" اور جہاں تک دوستی کا تعلق ہے نہ وہ یہاں ہے اور نہ دنیا کے کسی حصّہ میں!" اب اس کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا اور پھر چھٹّن کو مزید سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ خاموشی سے اُٹھ گیا۔ پھر سنّاٹا چھا گیا۔

گلاب خاں نے اپنے متعلق کوئی بات نہیں کی مگر اس کے باوجود چھٹّن کو اس کے متعلق سب کچھ پتہ چل گیا۔ نگراں اس کو اچھی طرح جانتا تھا اور کیسے نہ جانتا جبکہ چھٹّن نے جیل ہی کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ جس طرح گھر والے کچھ دیر تفریح کے لئے باہر جاتے اور پھر واپس چلے آتے ہیں اسی طرح چھٹّن بھی کچھ دنوں تک جیل سے باہر رہتا مگر جب دوستوں کی یاد دل کو ستانے لگتی تو پھر کچھ نہ کچھ کر کے جیل آجاتا۔ پرانے قیدی ہونے کے ناطے سے نگراں کا سلوک اس کے ساتھ بُرا نہ تھا۔ جب باہر جانے لگتا تو وہ نرمی، ملائمت اور متانت سے چھٹّن کو سمجھاتا کہ اب وہ ایک اچھا شہری بن جائے۔ اپنے کردار کی برائیاں دور کردے اور جرائم کے تاریک حصار میں جانے کی کوشش نہ کرے۔ مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا۔۔۔۔

جب چھٹّن نے نگراں سے گلاب خاں کے متعلق استفسار کیا تو وہ بے اختیار ہنس دیا اور دیر تک ہنستا رہا۔ پھر اس نے چھٹّن کو اس کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ چھٹّن غور اور دلچسپی سے اس کی بابت بتائی ہوئی باتیں سنتا رہا۔ اس کے حالات معلوم کر کے وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے تو یہی سمجھا تھا کہ گلاب خاں کوئی نامی گرامی قاتل ہوگا۔ ایسا قاتل جس کے نام سے پولیس کا سارا عملہ کانپتا ہوگا۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ قتل و غارت گری میں گزرا ہوگا۔ مگر کھودا پہاڑ نکلا چوہا! اس کو پتہ چلا کہ گلاب خاں نے خودکشی کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کو اپنی نوجوان بیوی سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اس کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے احساسات میں بالیدگی پیدا کر دیتی۔ اس کی نظروں کے اشاروں

میں اُس کو زندگی کی تمام تر لطافتیں ملتیں۔ مگر ایک دن ــــــ ایک دن گلاب خاں کا دل بجھ گیا۔ اس کی روح چیخ اٹھی۔ اس نے خلوت میں اپنی بیوی کو ایک نوجوان کے ساتھ دادِ عیش دیتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ پٹھان تھا۔ ہونا تو یہی چاہیئے تھا کہ وہ اسی وقت کلہاڑی سے دونوں کے سرتن سے جُدا کر دیتا۔ ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ مگر اس کے جسم میں غصّہ کی چنگاریاں نہیں سلگیں۔ اس کے دماغ کی رگیں نہیں جھنجھنائیں بلکہ وہ اداس ہو گیا۔ اس کی آرزوئیں مرجھا گئیں اور دوسرے دن ہی اس نے گندھک کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی قسمت میں موت بھی نہیں لکھی تھی۔ کاتبِ تقدیر نے شاید یہی لکھا تھا کہ وہ زندہ رہے اور رسوائیوں کی چوٹیں سہتا رہے۔ بروقت طبّی امداد نے اس کی جان بچالی۔ اس پر مقدمہ چلا۔ مجسٹریٹ کے سامنے کٹہرے میں کھڑے ہو کر وہ چلّایا۔

"میں نے مرنا چاہا تھا تم نے مجھے کیوں بچایا؟ میں مرنا چاہتا ہوں مجھے موت کی سزا دو۔ مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھا دو۔ ورنہ میں قید کاٹ کر پھر خود کو ہلاک کر دوں گا۔ اگر ایسا نہیں ہو سکا تو کسی اور مار دوں گا۔" شاید اُس کی ان باتوں پر اُسے معاف کر دیا جاتا مگر اس کے بعد اس نے مجسٹریٹ کو بھی بُرا بھلا کہا تھا جس پر اُسے توہینِ عدالت کے جرم میں ایک ماہ قیدِ بامشقّت کی سزا دے دی گئی۔

اور پھر یہ بات ایک کی وساطت سے دوسرے کے پاس پہنچی۔ دوسرے کی معرفت تیسرے کے پاس۔ اور پھر زبانِ زدِ عام وخاص ہو گئی۔ اس کے متعلق سب کچھ جان کر کسی کسی کو اس سے ہمدردی پیدا نہیں ہوئی۔ بس وہ دل ہی دل میں ہنستے رہے کیونکہ اس کے سامنے مسکرانا تو درکنار باتیں کرنا ان کے لئے دشوار کُن مرحلہ تھا۔ جب وہ ذرا دور ہوتا تو وہ چوری چوری اس کی جانب دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارہ کر دیتے۔ ان کے خیال میں گلاب خاں کے پہاڑ جیسے جسم میں چوہے کا دل تھا۔ وہ اس کو ڈرپوک اور بزدل سمجھنے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس نے پٹھانوں کی ناک کاٹ دی۔ ان کی رگِ حمیت پر کاری ضرب لگائی۔ اس کو چاہیئے تھا کہ اپنی بیوی اور اس کے آشنا کی گردنیں اڑا دیتا اور جب پولیس گرفتار کرنے آتی تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا۔ جب خدائے تعالیٰ نے ایسا آہنی جسم ودیعت کیا تو اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو

اٹھانا ہی چاہیئے تھا؟

گلاب خاں نے قید کا ایک مہینہ خاموشی سے کاٹ دیا۔ نہ خود سے کسی کو مخاطب کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی کی بات کا طویل جواب دیا۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بزرگ مراقبے میں ہو یا کوئی فلسفی غور و تعمق کی پر پیچ وادیوں میں بھٹک رہا ہو! اور یوں کسی نئی تھیوری کی اختراع میں یکسوئی، انہماک اور خاموشی سے کام لے رہا ہو!! کسی سے بات کرنا تو در کنار وہ کسی کو دیکھنے کی بھی کوشش نہ کرتا تھا۔ جیسے کسی پر نظر پڑتے ہی اس کا وجود ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ کھانا آتا تو وہ بہت دیر تک اس کو عجیب و غریب نظروں سے دیکھتا رہتا۔ اس کا ہاتھ آہستہ سے پلیٹ کی طرف بڑھتا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ پیچھے ہٹا لیتا اور چند ثانیوں کے بعد وہ چند نوالے حلق میں اس طرح اتارتا جیسے زہر مار کر رہا ہو۔

رات کو کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ جانے وہ کب سوتا تھا۔ جب بھی کسی کی نظر اس کی جانب سہمے ہوئے انداز میں اٹھتی تو وہ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کو آگ کے دو شعلوں کی طرح دہکتے ہوئے پاتا۔ اور اگر اس کی آنکھیں بند بھی ہوتیں تو وہ آہستہ آہستہ کھلتے رہتا۔ شاید وہ سوتا بھی تو سب کو یہی احساس رہتا کہ وہ بیدار ہے اور یہی احساس ان سے ان کی میٹھی نیندوں کو چھین لیتا۔ نیند کا پرتو قریب آنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ آنکھیں مل مل کر جاگنے کی کوشش کرتے۔ ان کو اس کی جانب سے یوں ڈر لگا رہتا تھا جیسے ان کے خوابِ خرگوش میں گم ہوتے ہی وہ ان کی گردنیں دبا دے گا!!

جس دن وہ رہا ہونے والا تھا تو اس دن دل ہی دل میں سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بلا ٹلنے والی تھی۔ مصیبت ختم ہونے والی تھی۔ اس کی وجہ سے پورے ایک ماہ سے جیل کی زندگی کی ساری رونق اور رعنائیوں پر جمود طاری تھا۔ جب دو پولیس کانسٹیبل اس کو لینے آئے تو چھٹن نے اس سے کہا۔

"خاں صاحب! رہائی مبارک ہو" اس پر گلاب خاں کے لبوں پر ایک زہرناک مسکراہٹ کا سایہ دوڑ گیا۔ جیسے چھٹن کی اس بات نے اس کے دل میں سوئے ہوئے تلخ جذبے کو انگڑائی لے کر بیدار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ چلا گیا۔ چھٹن کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ایک چرسی ناچنے لگا جیسے اس نے چرس کی سگریٹ کے کئی طویل کش لئے ہوں۔ گرہ کٹ ببو مسکرا دیا۔ جیسے زنداں میں بہار آ گئی ہو۔ اس سب کے چہروں پر تازگی اور شگفتگی پیدا ہو گئی۔ مگر یہ بشاشت، یہ خوشیاں دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ چھ مہینے بعد ایک دن گلاب خاں پھر آ گیا۔ اس بار اس کے چہرے پر کشمکش اور الجھن نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوفناک سائے رقصاں نہ تھے۔ وہ مطمئن اور آسودہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی رنگت اب بھی سُرخ تھی مگر وہ آگ کے شعلوں کی مانند نہ تھی۔ اس پر شفق کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ چھ مہینے میں جیل میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ ببو گرہ کٹ اور بہت سے قیدی رہا ہو گئے تھے۔ پرانوں میں چند ایک ہی رہ گئے تھے۔ چھٹن نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس کا نئے قیدیوں سے تعارف کرایا۔ اس وقت گلاب خاں کے لبوں پر زہر بھری مسکراہٹ نہیں ابھری۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار نہیں ہوئیں۔ وہ خاموش تھا مگر اس خاموشی میں ایک طرح کی طمانیت ملفوف تھی۔

دوسرے دن چھٹن کو نگران سے معلوم ہوا کہ فوری سماعت کی ایک خاص عدالت نے گلاب خاں کو عمر قید کی سزا دی ہے! اس نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا تھا۔ اس کے آشنا کو قتل نہیں کیا تھا۔ اس کا جُرم یہ تھا کہ اس نے اپنی چھ سالہ بیٹی کا گلا دبا دیا تھا۔ کہتے ہیں جب معصوم بچی ٹھنڈی ہو گئی تو وہ پہلے زور زور سے ہنسنے لگا۔ فلک شگاف قہقہہ لگاتا رہا اور چیختا رہا۔

"میں بچ گیا۔ میری عزت بچ گئی۔ میرے خاندان کی عزّت بچ گئی"۔ اور پھر بچّی کی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے اس کے گالوں کو پیار کیا۔ اس کی پیشانی کو چوما۔ اس کی آنکھوں کو چوما۔ اور پھر اس کے قدموں میں گر کر گڑگڑایا۔

"میری بیٹی! مجھے معاف کر دے! مجھے معاف کر دے!"

اور جب پولیس نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے اپنی بیوی کے منہ پر تھوک دیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر جلال تھا۔ دبدبہ تھا۔ تقدس تھا۔

عدالت میں وہ ایک بار پھر زوروں سے ہنسا۔

"میں نے اپنی بیٹی کو قتل کیا ـــــ تم مجھے وحشی کہہ سکتے ہو۔ جنگلی اور قاتل کہہ سکتے ہو۔ مگر جو کچھ میں نے کیا اس پر مجھے فخر ہے۔ میری بیٹی کے خون میں اس عورت کے جراثیم تھے جو بے وفا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی جوان ہو کر وہی کرے جو اس عورت نے کیا ہے۔ اور پھر دنیا اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہے کہ یہ گلاب خاں کی بیٹی ہے۔ اب وہ وقت نہیں آئے گا کبھی نہیں آئے گا۔ میں نے قتل کیا۔ مقدمہ کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پھانسی پہ چڑھا دو۔ اب میں سکون سے مر سکتا ہوں۔"

اور اس کو عمر قید کی سزا ہوگئی!

اور پھر اس بات کو ایک زمانہ گزر گیا! ایک عرصہ ہو گیا۔ شروع شروع میں لوگ اس سے خائف رہتے تھے۔ اس کے سائے سے بھی کتراتے تھے مگر جلد ہی سب کو پتہ چل گیا کہ اس کی صورت خوفناک ہے مگر اس کا دل نہیں! وہ پانی کے سانپ کی طرح بے ضرر ہے۔ اس سے کسی کو فائدہ تو پہنچ سکتا ہے مگر نقصان نہیں۔ وہ انسان ہے مگر انسانوں سے برتر! وہ ایک قاتل ہے مگر معصوموں اور بے گناہوں سے زیادہ بہتر۔ قتل کر کے اس کے کردار پر ایک داغ ثبت ہو گیا تھا مگر اس داغ کا حسن بے داغ کرداروں سے زیادہ جاذبیت کا حامل تھا ـــــ وہ اب بھی کم گو تھا۔ وہ اب بھی ہمہ وقت خیالوں میں مستغرق رہتا تھا۔ مگر اب وہ پہلے کی طرح بے چین نہ تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں اضطراب کی لہریں نہیں اٹھتی تھیں۔ وہ پرسکون تھا۔ جو کام اس کے سپرد کیا جاتا، پورے انہماک کے ساتھ اس کو پورا کرنے میں لگ جاتا تھا۔ اور جب وہ کام سے فارغ ہو جاتا تو دوسروں کے کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ جس کی وجہ سے اب سب اس کی عزت کرنے لگے تھے۔ سب کو اس سے اُنسیت ہو گئی تھی۔ چھٹن تو اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس کی تعریف ہر وقت اس کی زبان پر رہتی تھی۔ جس دن چھٹن کی رہائی کے احکام جاری ہوئے تھے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رویا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ جیل سے گھر نہیں جا رہا ہو بلکہ گھر سے جیل جا رہا ہو!

"خان بھیا!" اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔" زندگی بھر میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

وہ چلا گیا مگر اس کے جانے سے دوسروں کے خلوص میں شمّہ بھر کمی نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح گلاب خاں کے دیوانے تھے۔ جیلر نے بھی کبھی اس کو نہیں ڈانٹا تھا اور ڈانٹتا بھی کیسے جبکہ کبھی اس کو اس بات کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ وہ ہمیشہ نرمی، ملائمت اور دوستانہ انداز میں اس سے باتیں کرتا تھا جیسے اس کا دیرینہ اور لنگوٹیا یار تھا یا اس کا قریبی رشتہ دار تھا۔

گلاب خاں عجیب فطرت کا حامل تھا۔ اس نے جیل میں آنے کے بعد کسی چیز کی تمنّا نہیں کی تھی۔ کام کے سوا کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ ایک مشین تھا جس کا کام صرف کام کرنا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس کے سینے میں دل ہی نہیں ہے یا ہے تو مردہ! جیل کے قیدی جب ہفتہ میں ایک بار اپنے پاس آئے ہوئے ملاقاتیوں سے ملتے تو سب سے پہلے ان کی لائی ہوئی چیزوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ گھر کے دوسرے افراد کی خیر خیریت کی انہیں پرواہ نہ ہوتی اور اپنی فرمائشوں کا طومار لگا دیتے اور تملّقانہ طرزِ تخاطب سے انہیں اپنی مطلوبہ اشیائ لانے کی ترغیب دیتے۔ مگر گلاب خاں کے پاس تو کوئی آتا ہی نہ تھا اور جب دوسرے قیدی اس کو اپنی چیزیں پیش کرتے تو وہ ہلکے سے مسکرا کر نفی میں گردن ہلا دیتا۔ نگران نے کئی بار اس سے پوچھا تھا کہ اس کو کسی چیز کی خواہش تو نہیں ہے۔ مگر وہ چپ ہی رہتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کے چہرے پر روحانی کرب کے آثار ہویدا ہو جاتے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بے چینی جھلکنے لگتی تھی مگر وہ جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیتا تھا۔

اس کو جیل میں آئے گیارہ سال ہو چکے تھے۔ گیارہ بہاریں اس کی حالت پر مسکرا کر چلی گئی تھیں۔ گیارہ خزاؤں نے اس کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھا تھا۔ وقت اور زمانے نے اس میں کئی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ اس کے بال اب روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ بھنویں اور بپوٹے برف کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ کمر اس مغرور انسان کی طرح خمیدہ ہو گئی تھی جس کو قدرت نے عبرت ناک شکست دی ہو۔ اب وہ پہلے سے زیادہ تنہائی کا خوگر ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ کم گو ہو گیا تھا جیسے بڑھاپے کی وجہ سے

اُس کی زبان بھی تھک گئی تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ دوسروں سے ذرا ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ کر دور ——— اس طرف دیکھتا جہاں آسمان اور زمین ملتے دکھائی دیتے تھے شاید وہ اس جگہ جانے کا متمنی تھا۔ دوسرے قیدی آپس میں ہنسی مذاق کرتے۔ نئی خبریں ایک دوسرے کو سناتے۔

"یار! جانتے ہو، اب ملک میں الیف۔ ۱۶ بھی آگئے ہیں۔"

"الیف ۔ ۱۶! یہ کیا چیز ہوتی ہے بھائی؟" کوئی پرانا قیدی اشتیاق سے پوچھتا۔

"یہ لڑاکا ہوائی جہازوں کی ایک نئی قسم ہے دادا۔"

"اور ہاں بادشاہو! یہ سلے امریکہ اور روس بھی پَر نکال رہے ہیں۔"

"انہیں کیا ہوا؟"

"اب وہ خلاء میں خلائی جہاز بھیج رہے ہیں۔"

"خلائی جہاز!!" پرانے قیدی کی آنکھوں میں حیرت عود کر آتی۔

"ہاں خلائی جہاز!!" اس کو تم ہوائی گھوڑا بھی کہہ سکتے ہو۔ اس کی مدد سے تم اب چاند اور مریخ کی سیر کو بھی جا سکتے ہو۔"

"نہ جانے تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو۔" پرانا قیدی استعجاب سے سب کو دیکھتا رہ جاتا!

"ہاں دادا! آج کل سب کچھ ممکن ہے۔"

اور ان کی باتیں سن کر گلاب خاں کی سوچ کچھ اور گمبھیر ہو جاتی۔ اس کی پیشانی کی شکنوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ جیسے وہ سوچ رہا ہو کیا گیارہ سال میں دنیا کی کایا ہی پلٹ گئی؟ کیا دنیا اتنی بدل گئی؟ کیا ہر چیز کا ڈھانچہ بدل گیا۔ اور ایسے موقعوں پر وہ سوچنے لگتا کہ دنیا چاہے خود کو کتنا ہی تبدیل کرے۔ کتنے ہی روپ اختیار کرے مگر انسان کی فطرت نہیں بدل سکتی!!

اور پھر یکایک ایک دن جیل کی زندگی اپنی تمام تر قوت کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ اسٹاف کا ہر رکن سرگرم عمل ہو گیا۔ قیدیوں کو صفائی پر مامور کر دیا گیا۔ رونق، چہل پہل ہنگامہ ——— کسی قیدی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ نگرانوں کی آواز چیختے چیختے بیٹھ گئی

تھی۔ وہ ڈانٹ ڈانٹ کر سب کو تیزی اختیار کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ جیلر ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ ہر شے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں ہر شے آئینہ کی طرح صاف ہو گئی۔ گرد و غبار، گندگی اور غلاظت سب دور ہو گئی۔

دوپہر ڈھلنے کے بعد جیلر نے قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کچھ دیر بعد آئی جی صاحب انسپیکشن کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ کس طرح ان کا استقبال کریں۔ کس طرح ان کے سوالات کے جوابات دیئے جائیں۔ کس طرح ادب کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

شام ڈھلنے سے ذرا پہلے آئی جی کی کار جیل کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اگلے حصے پر پولیس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ہر قیدی ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ مگر گلاب خاں حسبِ معمول ایک کونے میں بے حس و حرکت گم سم بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد آئی۔ جی جب اس کے قریب سے گزرنے لگے تو وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس کے محیر العقول ڈیل ڈول اور ہئیت کذائی نے مقناطیس کی طرح ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا۔ انہوں نے جیلر سے اس کے متعلق استفسار کیا۔ اس نے انکساری اور ادب سے اس کے متعلق بتا دیا۔

"گلاب خاں! آئی جی صاحب کو سلام کرو۔"

اس کی بوڑھی آنکھیں ان کی جانب اٹھیں۔ عمر کی زیادتی بھی اس کی آنکھ کے شعلوں کو نہ بجھا سکی تھی۔ آج وہ معمول سے زیادہ دہک رہی تھیں۔ اس کا چہرہ نہ جانے کیوں سُرخ ہو رہا تھا۔

"گلاب خاں! کیا تمہاری کوئی خواہش ہے؟" آئی۔ جی نے اس انداز سے پوچھا جس طرح پھانسی کے مجرم کی آخری خواہش دریافت کی جاتی ہے۔ اچانک گلاب خان کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں جذبات کی شدّت سے لڑکھڑانے لگے۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"کہو! ہم اس کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں ایک دن ۔ کے ۔ لیے باہر کی دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ ارد گرد کھڑے سارے لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان سب کو جیسے حیرت نے زیر کر دیا تھا۔ پہلی مرتبہ انہوں نے گلاب خاں کو کسی چیز کی تمنّا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتھر پر پھول پیدا ہو گیا تھا۔ سمندر میں آگ لگ گئی تھی، آسمان کچھ اور جھک گیا تھا۔ آئی۔ جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دوسرں

کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ جاتے وقت انہوں نے گلاب خاں کو مسکرا کر دیکھا تھا۔

تین گھنٹے بعد جیلر آیا۔ بے شمار آنکھیں اس کی جانب اُٹھ گئیں۔ ہر ایک میں ایک ہی بات معلوم کرنے کی خواہش تھی۔ اس نے آتے ہی گلاب خاں کے کندھے پر اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا۔

"گلاب خاں! آئی۔ جی صاحب نے حکم دیا ہے کہ تمہاری خواہش پوری کر دی جائے۔ کل ایک بار پھر تم باہر کی دنیا کو دیکھ سکو گے۔ صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک تمہیں جی بھر کر تفریح کرائی جائے گی ——— جاتے وقت وہ تمہاری فائل بھی لے گئے ہیں ——— ممکن ہے وہ عنقریب تمہیں رہا کر دیں ——— میں نے تمہاری خوب تعریف کی ہے۔"

اس رات وہ سو نہ سکا۔ دوسرے قیدیوں کا کہنا تھا کہ وہ بہت بے چین اور بے قرار معلوم ہو رہا تھا۔ کبھی کروٹیں بدلنے لگتا۔ کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ خلا میں ہاتھ ہلاتا یا مٹھیاں بھینچ کر زور زور سے سر کو جھٹکنے لگتا۔ وہ رات بھی بڑی خطرناک تھی۔ رات بھر بادل گرجتے رہے۔ بجلی چمکتی رہی۔ جوں توں کر کے صبح ہو گئی۔ اس وقت وہ سو رہا تھا۔ اس کے لبوں پر معصومانہ مسکراہٹ تھی۔ کسی نے اس کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ حتیٰ کہ جیلر خود آ گیا۔

"گلاب خان! اٹھو وقت ہو گیا ہے۔ پولیس وین تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" اس نے اُس کو جھنجھوڑا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح چونک پڑا۔ گلاب خاں کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ اس کی پیشانی سفید ہو گئی تھی۔ وہ مر چکا تھا!

تتلی کے رنگ

نہ جانے اتنا حبس کہاں سے آ گیا تھا!

شکور کی حساس سیمابی فطرت کے لئے یہ موسمی غضب بن بلائے مہمان کی طرح کم آفت خیز نہ تھا۔ دن تو مصروفیات اور ہنگاموں کی نذر ہو گیا تھا مگر رات شیطان کی آنت بن کر رہ گئی تھی۔ ایسی حالت میں نیند کی توقع عبث تھی۔ وہ تو روٹھی ہوئی محبوبہ کے انداز کو اپنائے مشقِ ستم پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔ بھلا ایسے موقعہ پر وہ کیسے مان سکتا تھا کہ سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے۔

یہاں تو وہ بستر پر تھا اور کب سے جاگ رہا تھا!!

رات موت کے احساس کی طرح فضاؤں پر چھائی ہوئی تھی۔ فضائیں خاموش تھی جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہوا ہوا کا دور دور تک پتہ نہ تھا جیسے پروردگار کے لبوں نے سانس لینے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ پسینے سے شرابور، حال سے بے حال، کھلے آسمان کے نیچے ایک بوسیدہ سی چرچراتی ہوئی کھاٹ پر شکور نے اتنی کروٹیں بدلی تھیں کہ پچاس سالہ دورِ محبت میں بھی کسی نے محبوبہ کے انتظار میں اتنی کروٹیں نہ بدلی ہوں گی ـــــ اچانک وہ بُری طرح چونکا! اسے احساس ہوا کہ وہ پیاس کے بے آب و گیاہ صحراؤں میں بھٹک رہا ہے۔ جیسے اس کی انگ انگ کی پیاس وجود کی گہرائیوں سے نکل کر کائنات کے طول و عرض میں پھیل جائے گی۔ وہ اچھل کر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ اُس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے اِرد گرد رات کی تاریکیوں میں یوں اضافہ ہو رہا تھا جیسے بُرے وقت میں انسان کی پریشانیاں بڑھتی ہیں۔

حلق کی خشکی دور کرنے کے لئے پوری اکیس ۲۱ سیڑھیوں کو عبور کرنے کی ضرورت تھی۔ نچلی منزل تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف نہ تھا اور نہ وہ اتنا نڈھال و بے حال ہوا تھا کہ

اس قدر مشقت برداشت نہ کر سکتا مگر ایک حدِ فاصل تھی جس کو بے محابانہ انداز میں پار کرنے میں ہچکچاہٹ سی مانع تھی ــــــ شدید مایوسی کے احساس سے بغلگیر ہوتے ہوئے وہ پھر کھاٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

اب اُس نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کا چہرہ اُس شخص کے چہرے سے مختلف نہ تھا جو پیاسی زندگی کے بھنور میں پھنس کر ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ مختلف النوع خیالات گرتے سنبھلتے ہوئے اس کے ذہن میں جڑ پکڑتے جا رہے تھے اور کان ایک ایسی انجانی آہٹ کے چھپاکے سے گونج رہے تھے جو تصور کو پَر لگا دیتی ہے مگر تصور کی اڑان زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ ذہن نئی انجانی فضاؤں کی رنگینیوں سے کتنی دیر لطف اندوز ہو سکتا ہے؟ اپنے ماحول میں واپس آ کر زمین کے گول ہونے کا ثبوت فراہم کرنا ہی پڑتا ہے۔ اپنی زندگی کے تاریک گوشوں پر نظر پڑی تو اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ یہ وہ زندگی تو نہ تھی جس کو ماضی میں اس نے اپنے تصور سے وابستہ کیا تھا۔ وہ تو ایک کامیاب ترین آدمی بننے کے بڑے بڑے خواب دیکھتا رہا تھا مگر اُسے کیا پتہ تھا کہ نامساعد حالات کی بیدرد ٹھوکریں اُسے ایک کامیاب ترین آدمی کے خوبصورت گھر میں ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور کر دیں گی! اب وہ زندگی کے اس جھٹپٹے میں پہنچ چکا تھا جو بجھتی ہوئی اُداس شاموں سے ملتے جلتے احساسات اور ڈوبتی ہوئی دھندلی روشنیوں سے ملتے جلتے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ایسا جھٹپٹا جب امیدوں نے رختِ سفر باندھ لیا ہو اور خوشی کے آنے کی آخری اُمید بھی ستارہ سحری کی طرح چپکے سے ڈوب گئی ہو۔

اگرچہ ان دنوں جہاں وہ ملازم تھا اُسے کوئی پریشانی نہ تھی مگر اب اُسے کیا کہیئے کہ وہ کاتبِ تقدیر سے ایک پریشان اور دکھی وجود لکھوا کر دنیا میں آیا تھا۔ مالک اور مالکن دونوں ہی بہترین صفات کے حامل تھے۔ گھر والا ایک میانہ قد آدمی تھا۔ عمر یہی کوئی پینتیس سال ہوگی۔ اس کے سیاہ اور چمکدار بالوں میں چند سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح جگمگاتے تھے۔ خدوخال بڑے جاذبِ نظر اور سجل تھے۔ آنکھیں یوں چمکتی تھیں جیسے ان میں بجلیاں سی ناچ رہی ہوں مگر کبھی کبھی شکور نے اس کے چہرے پر دبیز سوچ اور گہرے تفکر کے آثار ابھرتے دیکھے تھے۔ ایک ایسی کیفیت جو محض متفکر اور کسی گمبھیر مسئلہ پر غور کرنے والے آدمی

کی کیفیت نہیں ہو سکتی تھی۔ مالکن ایک جوان عورت تھی جس کا بدن گداز گداز سا تھا۔ چہرے پر کبھی کبھی مسکراہٹ کا نور برسنے لگتا تو یوں لگتا جیسے موسم بہار کا سورج فیاضی سے اپنی شعاعیں نثار رہا ہو! یوں تو اس کی آنکھیں بڑی پُر کشش تھیں مگر ان کے دیکھنے کا انداز ہوش ربا اور پر تمکنت تھا جیسے اس چیز کو مسخر کر لیا ہو جس کو سب نے متفقہ طور پر ناقابل تسخیر قرار دے دیا تھا۔ جب وہ شانِ استغنا سے جھومتی ہوئی چلتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کائنات کی رعنائیوں میں اضافہ ہو رہا ہو۔ اس کا بھرپور انداز زمین سے اٹھ کر آسمانوں کو چھو لینے کی آرزو کا غماز تھا!!

کہا تو یہی جاتا ہے کہ مثالی مرد اور مثالی عورت کا ملاپ ہو جائے تو زندگی مثالی بن جاتی ہے مگر یہاں تو معاملہ اُلٹا ہی تھا۔ شکور نے تو یہی محسوس کیا تھا کہ دونوں کے باہمی تعلقات کچھ خوشگوار نہیں۔ اگرچہ اس نے دونوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کبھی نہیں دیکھا تھا مگر ان کا رویہ اور طرزِ عمل ان کی ازدواجی زندگی کا آئینہ تھا جس نے ان کے تمام مخفی پہلوؤں کو اجاگر کر دیا تھا۔ اس نے دونوں کو بہت کم ایک دوسرے کے قریب بیٹھے دیکھا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے کے لئے الرجک بن گئے تھے۔ بسا اوقات وہ ایک دوسرے سے بالکل ہی لاتعلق معلوم ہوتے۔ چند مرتبہ شکور نے دیکھا تھا کہ مالکن کو دیکھتے ہی اُس کے مالک کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ کا پَرتو ابھرتا۔ ایک ایسی زبردستی کی مسکراہٹ جس میں پشیمانی کا ہلکا سا عنصر بھی شامل ہوتا ——— مگر شکور کے باب میں دونوں کا برتاؤ بڑا دوستانہ تھا۔ کبھی کبھی تو ان کی باتیں سُن کر اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اُس کو اپنا قریبی دوست، اپنا دست راست سمجھتے ہیں۔ اُن کا نرم اور خوشگوار لب و لہجہ مالکانہ تکبر سے بالکل ہی عاری ہوتا۔ شکور کے لئے یہ ایک نیا اور پہلا مثبت تجربہ تھا ورنہ اس کی زندگی تو جڑ تک دنیا والوں کی صلواتوں اور ناروا سلوک کے پاتال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور شاید یہ ان کا دوستانہ برتاؤ تھا جس نے اُس کے دل میں اُن کے لئے مخلصانہ جذبہ اور گہرا اُنس پیدا کر دیا تھا۔ کئی بار اُس کے مالک نے اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"کیوں دوست! یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں" وہ فراخدلی سے مسکرا دیتا۔ "تکلف سے کام نہ لینا"

اور کبھی اس کی مالکن گنگنانے کے انداز میں اُس سے مخاطب ہوتی۔

"شکور! اس گھر میں خود کو اجنبی نہ سمجھو! جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف ہو کر مجھ سے کہنا۔"

اظہارِ تشکر کے طور پر اس کا سر زمین بوس ہو جاتا۔ وہ سوچتا جس شخص کو بلا ضرورت ہی دکھ درد مل گئے ہوں اُسے بھلا کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے! ایسے موقعوں پر اس کے اپنے پرانے غم آگئیں احساسات کہیں دور کسی بے نام سی گپھا میں تھک کر سو جاتے اور دونوں کی ازدواجی الجھنوں کا خیال اُس کا اپنا غم بن کر دل میں ابھرتا۔ وہ یہ سوچ کر متوحش ہو جاتا کہ اس کی تقدیر کی ازلی نحوست بُرا شگون بن کر اس گھر کے در و دیوار پر تو مسلط نہیں ہو گئی؟

مالک عموماً تجارتی سلسلے میں مہینے میں دو ایک روز کے لئے گھر سے باہر رہتا تھا۔ اس دوران مالکن کے چہرے پر طمانیت مجنونانہ سرخوشی بن کر یوں رقصاں ہو جاتی جس طرح کوئی مریض کسی موذی مرض سے صحت یابی کے بعد خود کو حقیقی مسرتوں کے قریب پاتا ہے۔ بہترین بھڑکیلے لباس میں اُس کا صندلیں جسم پھولوں سے لدی ہوئی ایک لچکتی شاخ بن جاتا۔ سولہ سنگھار سے مرصع ہو کر وہ یوں اِتراتے ہوئے شاہانہ انداز میں اِدھر اُدھر ناچتی پھرتی جیسے مدتوں کی قید کے بعد اُسے آزادی کی دولت نصیب ہوئی ہو!!

"شکور!" اُس کی آواز دلی مسرت کی مظہر ہوتی اور شکور کے لئے وہ نِدا کی صدا بن جاتی۔ وہ نامکمل کام چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے اس کے نام کی صدا دو چار بار در و دیوار سے ٹکرا کر معدوم ہو جاتی۔

"اوہو ۔۔۔۔ تم کہاں تھے شکور؟"

"بی بی جی ۔۔۔۔ بس ۔۔۔۔" شکور کی آواز میں لکنت آجاتی۔

"میں کب سے تمہیں آواز دے رہی تھی مگر ۔۔۔۔"

"جی ۔۔۔۔ میں کام کر رہا تھا۔"

"اب چھوڑو بھی کام کو۔" اس کا چہرہ معصوم خوشیوں کے نور سے غسل کر کے شعلہ طور بن جاتا۔ "کام تو روز ہوتا ہے۔ بیٹھو نا؟ یوں کیا مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے ہو۔" اس کے

سریلے قہقہے کا جلترنگ بج اٹھا تو شکور کے رہے سہے ہوش و حواس بھی پرواز کے لئے پنکھ کھول دیتے۔ وہ بادلِ ناخواستہ ایک کرسی پر بیٹھ جاتا۔

"جی ــــ جی ــــ کچھ کام ہے۔"

"کام ــــ" وہ ایک لمحہ کے لئے سوچتی۔ "کیا کام کے بغیر دو نفوس یکجا نہیں ہو سکتے۔" شکور جیسے سادہ لوح انسان کے لئے یہ فلسفہ بڑا ادق ثابت ہوتا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

"جی ــــ بی بی جی ــــ" وہ ہکلانے لگتا۔

"آج میں بہت خوش ہوں نا؟" وہ پوچھتی اور شکور اثبات میں سر ہلا دیتا۔

"تمہیں وجہ معلوم ہے؟" اس بار وہ نفی میں سر ہلا دیتا۔

"چلو چھوڑو ــــ تم ان باتوں کو کیا سمجھو گے!" اس کی فراخ پیشانی پر سوچ کی متوازی لکیریں نمودار ہو جاتیں ــــ "تمہیں کیا معلوم زندگی میں کیا ہوتا ہے؟" اور تب شکور کا جی چاہتا کہ کہہ دے۔

"بی بی جی ــــ یہ محض آپ کا خیال ہے۔ شاید آپ کے غم میرے دکھ درد سے زیادہ وزنی ہوں مگر میرے احساس نے میرے چھوٹے چھوٹے غم کو بھی پہاڑِ اعظم بنا دیا ہے۔ چہ جائیکہ بڑے غم ــــ اور پھر دکھ کسی بھی ذات سے وابستہ ہوں، مشترک نہ ہونے کے باوجود روح کا رِستا ہوا ناسور ہوتے ہیں۔"

مگر رعب و دبدبہ کا احساس اس کی زبان پر قفلِ سکوت لگا دیتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اس کی روح پر دباؤ ڈال رہی ہو ــــ اور تب چند لفظوں کی خاموشی میں ڈوب کر اس کی مالکن بڑی خوش آہنگ روانی میں سوالات کا ایسا طومار باندھ دیتی کہ جیسے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ہو! بعض سوال عام فہم ہوتے مگر جواب دینے کی کوشش کرتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے اس کی زبان کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہو۔ کچھ سوال اس کی فہم سے بالا ہوتے جن کا جواب اس کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ سوالات کا خزانہ خالی نہ ہوتا۔ شاید مالکن کو صرف پوچھنے کا شوق تھا جوابات کی مطلقاً پرواہ نہ تھی۔

کافی دیر بعد جب اسے احساس ہوتا کہ وہ ایک خوبصورت اور جوان عورت کے پاس تنہا

کھڑا ہے تو وہ ہنڈیا جلنے کا بہانہ بنا کر اس کی مرضی کے خلاف وہاں سے کھسک جاتا ــــ رسوئی میں وہ گھنٹوں یہی سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے ؟ اس کا تو اُسے اندازہ تھا کہ کوئی غم گھن بن کر اس کی مالکن کو کھائے جا رہا ہے مگر وہ غم کس خمیر سے اٹھا؟ اس کا وجود کن محرکات کا مرہونِ منت ہے ؟ وہ گھنٹوں کی مسلسل عرق ریزی اور دماغ سوزی کے باوجود کچھ نہ جان سکتا !

اچانک پیاس بجھانے کی منہ زور خواہش نے پھر ایک بار جوش مارا تو سوچ کا تسلسل کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گیا ــــ وہ یوں اپنی دنیا میں واپس آ گیا جیسے ٹراؤٹ مچھلی چند لمحوں کی اڑان کے بعد پھر پانی میں گر جاتی ہے ۔ اسے محسوس ہوا جیسے پانی نہ ملا تو اس کا جسم پھٹ کر چیتھڑوں کی شکل میں فضا میں بکھر جائے گا ۔ پیاس اب اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی ۔ نہ جانے یہ خواہش ، یہ طلب کس نوع کی تھی ؟ زندگی میں کسی بھی طلب نے اتنے شدید اور جارحانہ انداز میں اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہ کی تھی ۔ شاید سب کو اس حقیقت کا علم تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے مگر آج تو جیسے ایک ضدی اور سرکش پیاس بجھانے کی پیاسی طلب نے بار بار اُبھر کر اس کی انا پر کاری ضرب لگا دی تھی ۔ اس کی کم مائیگی کا مذاق اڑایا تھا !!

اور پھر جیسے اُس نے ہتھیار ڈال دیئے ۔ گھٹنے ٹیک دیئے اور مردہ انداز میں کھاٹ سے یوں اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی کے تنِ مردہ میں آدھی روح کی سرسراہٹیں گونج اٹھی ہوں ۔

سیاہ رات کے سیاہ آسمان نے چاند ستاروں کو جیسے ہمیشہ کے لئے نگل لیا تھا ۔ وہ یوں قدم گن گن کر سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی روح اپنی کھوئی ہوئی مرتوں کو تلاش کرتی ہے ۔ نچلی منزل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے وہ چند لمحوں کے لئے سیڑھیوں کے پاس رک گیا ۔ اُس کی ذہنی کیفیت اُس آدمی سے مختلف نہ تھی جس نے روح فرسا مراحل طے کر کے کوئی فیصلہ تو کر لیا ہو مگر اس کے باوجود مطمئن نہ ہو سکا ہو ۔ ایک بے نام سا احساس اس کے رگ و پے میں رچ کر خاموش ہلچل کے طوفان بیدار کر رہا تھا ! جیسے وہ اپنے آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر الفاظ نطق پر دستک دینے کے بعد کسی گوشے میں دبک کر بیٹھ

گئے ہوں۔ حوصلوں اور جرأت کو جمع کر کے اس نے پہلی سیڑھی پر یوں قدم رکھا جیسے کسی کم ہمت تیشہ بردار کو کوہ کنی پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ پھر اس کے بعد اُسے کچھ پتہ نہ چلا کہ اُس نے بقیہ سیڑھیاں کس طرح طے کیں۔ اُس کے خوابیدہ حواس اس وقت بیدار ہوئے جب اس نے آخری سیڑھی عبور کر لی تھی۔ اُس کے بائیں جانب ڈائننگ روم تھا جہاں پیاس بجھانے کا وافر سامان تھا ایک کونے میں قدِ آدم سفید ریفریجریٹر یوں کھڑا تھا جیسے کوئی سفید پوش آسمانی فرشتہ خیر و برکت کا خزانہ لٹاتے آ گیا ہو!

اچانک اُس نے سامنے دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کی نظریں چوکھٹ عبور کر کے دَرّانا اندر داخل ہو گئیں۔ ہلکے نیلے رنگ کی روشنی میں کمرہ رنگ بھرے خوابوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک حیات آگئیں منظر سامنے تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ الف لیلوی ابوالحسن کی طرح ہکا بکا، بھونچکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے! بار بار دیکھنے کے باوجود سیر چشمی کے آثار کوسوں دور تھے۔ یہ حقیقی جذبات اور سچے احساسات کی رات تھی۔ اس کی نظروں کا مرکز ایک کشادہ اور بے حد سجی سجائی مسہری تھی جس پر اُس کا مالک اپنی شریک حیات کے ساتھ محوِ استراحت تھا۔ دونوں چولی دامن کی طرح ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے مگر جسموں کے اتصال کے باوجود روحوں کا ملاپ نہ ہو تو یقیناً یہ ایک المیہ ہے۔ ایک دوسرے کے قریب رہ کر دور ہونے سے بہتر یہی ہے کہ دور رہ کر ایک دوسرے کے قریب آ جائیں تنکور نے محسوس کیا کہ اس کا دل بھر آیا ہے!

وہ اپنے غموں سے بے نیاز معصوم فرشتوں کی طرح نیند کی مہربان آغوش میں کھوئے ہوئے تھے۔ بیداری کی تلخیاں خوابوں کی دھند میں چھپ چکی تھیں۔ اچانک تنکور کے احساسات ساز سے نکلی ہوئی آواز کی طرح کپکپا کر رہ گئے۔ اس کی نگاہیں نگوں سار ہو گئیں! اس نے سوچا اُسے یوں نہیں دیکھنا چاہیئے۔ نظروں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ وہ سرشار احساسات کا خزانہ لئے ڈائننگ روم میں داخل ہو گیا۔ مگر اب جبکہ پانی سامنے تھا تو اس کی پیاس غائب ہو گئی تھی۔ مگر اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ سمندر کے قریب سے حلق بھگوئے بغیر لوٹ جائے۔ اس کا بدن ابھی تک انجانے جذبوں کے زیرِ اثر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی؟ کمرے کا

اندھیرا یا بے نام اندیشوں کا احساس کہ راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود اس نے ایک ایسی ٹھوکر کھائی کہ سنبھلنے کی کوشش میں وہ دو مرتبہ آگے پیچھے جھول گیا۔اس قلیل عرصے میں اس کے ہاتھ کا گلاس فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا!اور آواز سے در و دیوار کی خاموشیوں نے سہم کر آنکھیں کھول دی تھیں۔اس کی حالت ناقابلِ بیان ہو گئی۔چھٹی حس نے آنے والے طوفان کی خبر دے دی تھی۔وہ بلّی کی طرح بغیر آواز پیدا کئے تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔اور اسی لمحے اس نے اپنے مالک کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنی۔

"کون ہے۔؟ کون۔؟"

شکور کا دل بیٹھنے لگا۔وہ جانتا تھا کہ اس پر شبہ کیا گیا تو وہ اپنی صفائی پیش نہ کر سکے گا۔ اس کا دل ایک سو میل کی رفتار سے دوڑنے لگا۔جوں ہی اس نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا اس کے مالک کی آواز دوبارہ ابھری۔

"اوہ۔گلاس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔اس بلّی نے پریشان کر دیا ہے۔"

اس بار طمانیت کا رنگ اس کے چہرے پر اُجاگر ہو گیا۔مگر خوف ہنوز دل میں جاگزیں تھا۔ وہ اندیشوں کی دیوار سے سر ٹکراتا ہوا کھاٹ پر دراز تو ہو گیا مگر نیند کا پتہ نہ تھا۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ڈراؤنا حادثہ باہیں پسارے اس کی سمت بڑھتا چلا آرہا ہے۔جیسے کچھ ہوا ہی چاہتا ہے۔انسانی خوف کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر وہ بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ ماہیِ بے آب کی طرح پیاس سے تڑپ رہا تھا۔

رات اس کی حالت زار پر یوں ہنستے ہوئے گزر رہی تھی جیسے کوئی اپنے دشمن کی ناکامیوں پر جشن مناتا ہے۔اب موسم نے اپنے کڑے تیور درست کر لئے تھے۔حبس کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ مگر اسے اتنا ہوش کہاں تھا کہ ان خطوط پر سوچ سکتا۔اُسے یقین تھا کہ نیچے اس کی تباہی کے منصوبوں کو آخری شکل دی جا رہی ہو گی۔

اُس کے چاروں طرف سناٹے یوں پھیلتے جا رہے تھے جیسے طوفانی دریا شاداب وادیوں کا سہاگ لوٹتے ہوئے بہتا چلا جائے۔۔اب رات دم توڑنے کے مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔صبح کے بھرپور آثار پیدا ہونے سے پہلے کی لطیف مدّہم نیم تاریک روشنی کی چادر کسی شرمیلی

دوشیزہ کے بلوریں سینے پر پھیلے ہوئے دوپٹہ کی طرح فضاؤں پر آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ اسی خوابناک ماحول میں مٹیالے مکانات کی پرچھائیاں یوں اُبھر رہی تھیں جیسے خوابوں کے کردار آہستہ آہستہ حقیقی دنیا میں قدم رکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اور پھر کچھ دیر بعد نئی صبح کے آغاز پر نئے دن کی عملی زندگی شروع کرنے بڑے بڑے انسانی ہیولے یوں گلی سے گزرنے لگے جیسے دریا کے تیز بہاؤ میں چلے آرہے ہوں۔

شکور کھاٹ سے یوں اٹھا جیسے کوئی دنیا سے اٹھتا ہے۔ خوف اب تک اس کے اعصاب پر بُری طرح مسلط تھا۔ ایک بار تو اُس نے سوچا کہ اپنا سارا سامان یہیں چھوڑ کر چپکے سے نو دو گیارہ ہو جائے۔ دونوں کا سامنا کرنے کی جرأت وہ خود میں نہیں پا رہا تھا۔ جیسے اس کی حیثیت ایک معمول کی سی تھی اور اس کے سامنے عامل کی سحر پاش آنکھوں کا جال بچھا ہوا تھا اور اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ آنکھوں میں ایک بار جھانکتے ہی اس کی ناکردہ گناہی اپنے سر پر گناہ کا سارا الزام دھر لے گی۔ پھر بھی وہ جرأت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا کر کے نیچے اتر ہی گیا۔

زندگی کی معمولات کا نیا دن طلوع ہو چکا تھا۔ وہ روزمرہ کے کاموں میں مشغول تو ہو گیا مگر اس کی ساری توجہ ایک ایسے حادثہ کی طرف مرکوز تھی جو ہنوز معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ بظاہر سکون ہی سکون تھا۔ دونوں میاں بیوی جاگ چکے تھے۔ ایک بار کسی کام سے مالکن رسوئی میں چند ثانیوں کے لئے آئی تھی۔ اس کا طرزِ عمل گہرے سمندروں کے سکوت کا مظہر تھا۔ شکور کی بگڑی ہوئی حالت اور بگڑ گئی۔

دن کافی چڑھ گیا تھا۔ دیواروں پر دھوپ کی ابلتی ہوئی شعاعیں ناچنے لگیں۔ اس کا مالک حسبِ معمول وقتِ مقررہ پر آفس جا چکا تھا۔ مگر اب تک کچھ بھی نہیں ہوا تھا مگر اس کے باوجود شکور یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ کچھ ہونے کی امید آخری سانس لے چکی ہے!

"شکور" اچانک مالکن کی آواز اُبھری۔ اور وہ بیدِ مجنوں کی طرح لرزہ براندام ہو کر رہ گیا۔

"شکور۔ کہاں ہو؟" آواز نے دوبارہ اس کا تعاقب کیا۔ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے اس کے سامنے آ گیا۔

"کل رات تم نیچے آئے تھے؟" ایک سوال خنجر بن کر اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔

"بولو — کل رات . . ."

"جی . . . جی . . . میں" اس کی زبان نے اس کے خیالات کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

"تم پاگل ہو"

"جی" شکور نے حیرانی سے اپنا سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ مسحور کن نقرئی مسکراہٹوں کی روشنی سے دور کے چاند کی طرح جگمگا رہا تھا۔

"میں نے کہا تم پاگل ہو" اُس نے اپنے الفاظ بھرپور بے ساختگی اور تاثرانگیز طور پر ادا کئے "تمہیں آنے کی ضرورت کیا تھی؟ تمہارے مالک کو شک ہو جاتا تو۔؟"

"شکور کو محسوس ہوا جیسے اجنبی احساسات کی رسہ کشی اعصاب کی زنجیر کو توڑ کر اس کی ذہنی صلاحیتوں کے پرخچے اڑا دے گی۔ وہ کہے جا رہی تھی۔

"بدھو! جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ جب تمہارے مالک دورے پر ہوں تب . . ."

اور وہ اُس کے قریب آگئی۔ سب کچھ اس کے قریب آگیا۔ گداز صندلیں باہیں، پیاس سے کھلتی ہونٹوں کی کلیاں، دہکتے عارض، پیاسی سانسوں کی سنسناتی آنچیں — سارا مرمریں جسم جو جواہر کی دکان تھا — مگر شکور کا دم گھٹ رہا تھا۔ حبس اور حرارت کا احساس جاگ گیا تھا۔ جیسے اس کے سامنے آگ دہک رہی تھی اور اس آگ میں اس کی روح سوکھی لکڑی کی طرح جلتی جا رہی تھی!!
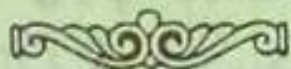
جلنے کے لئے

جب صبح اس کی بیوی نے اس کو بیدار کیا تو اُس نے اپنے جسم میں سوئیاں سی چبھتی محسوس کیں۔ سارا بدن ایک کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں کھولیں اور پھر جلدی سے موند لیں۔ جھگی کے ایک شگاف سے آنے والی سورج کی تیز کرنیں اس کی آنکھوں میں گھس گئی تھیں۔ دیر سے خوابوں کے اندھیاروں میں بھٹکنے والی دو آنکھوں کو شاید یہ روشنی ناگوار گزری تھی۔ وہ چند لمحوں تک آنکھیں موندے اسی طرح چت لیٹا رہا جیسے ہولے ہولے اس کی تھکن دُور ہو رہی ہو! اور پھر وہ ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ سینے کے بل ہو گیا۔ ابھی تک اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اندھیرے اس کو بھائے ہے تھے۔ روشنی سے وہ گھبرا گیا تھا۔ اس کروٹ پر اس کو راحت سی محسوس ہو رہی تھی۔ درد کی لہریں یوں آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھیں جیسے اس کے سینے کے نیچے دب کر دم توڑ رہی ہوں۔ اس وقت وہ بالکل خالی الذہن تھا۔ اس کو کسی بات کا ہوش نہ تھا خیالات اس سے دُور تھے۔ دنیا میں کیا ہو رہا تھا؟ کیا ہونے والا تھا؟ وہ ان کے متعلق بالکل نہیں جانتا تھا۔ اور حقیقت میں وہ ان تلخ حقائق کو جاننے کا خواہش مند بھی نہ تھا اس کو بخوبی علم تھا کہ یہ چیزیں روح کے لئے ایک مستقل ناسور ہیں۔ دل کے لئے درد، اور جسم کے لئے ایک لازوال تھکن! پچھلے دنوں کی بھاگ دوڑ اور ذہنی کلفت نے اس کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ان سے بھاگ کر ایک ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں اس کے ذہن سے خیالات لکڑی سے دیمک کی طرح چمٹے نہ ہوں۔ اور وہ اس وقت آنکھیں موندے ایسی ہی دنیا کی سیر کر رہا تھا!

بیوی نے جب اس حالت میں دیکھا تو سمجھی کہ شائد وہ پھر سو گیا ہے۔ اس نے اُس کو بُری طرح جھنجھوڑ دیا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ اس کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔

"بات تیری ——" اُس نے اُٹھتے ہی ایک زوردار ہاتھ چلایا جو اس کے سر کی اوپری سطح کو سہلاتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سلگنے لگی تھیں اور وہ بے چاری دُور کھڑی سہمے ہوئے انداز میں اُس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"حرام زادی —— تو تیری ——" اس کے جملے غیر مربوط ہی رہے۔ غصّہ کی شدّت اس کو اول فول بکنے پر مجبور کر رہی تھی مگر وہ ایک لفظ بھی اس کے آگے نہ کہہ سکا۔ اس کے سینے پر بوجھ سا محسوس ہوا جیسے گالیوں کی ساری گندگی اور غلاظت وہاں مجتمع ہو گئی تھی!

"مجھے کیا پتہ تھا —— تم ہی نے تو کہا تھا کہ ——" وہ بے چاری ہکلا ہکلا کر بولی اور وہ ایک دم نرم پڑ گیا۔ غصّہ کے بادل بھک سے اڑ گئے۔ پتہ نہیں اُس کے چہرے کی بے چارگی اور خوف نے اس کو پگھلا دیا تھا یا کوئی اور وجہ تھی!

"میری جان! مجھے معاف کرنا،" وہ خجالت سے بولا "ان حالات نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔" اس کے لہجے میں خفت بھی تھی اور ہلکی سی اُداسی بھی! نیند ابھی تک اس کی آنکھوں میں مچل رہی تھی۔ جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں مگر اس بار اُس نے سونے کی کوشش نہیں کی اور بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے ذرا دُور اس کی بیوی کھڑی اُس کی حرکات و سکنات کا بہ غائر جائزہ لے رہی تھی مگر اب اُس کے چہرے پر خوف کے آثار نہ تھے بلکہ وہ مسکرا رہی تھی۔ اگر ایمانداری سے کہا جائے تو یہ مسکراہٹ مسکراہٹ نہ تھی کوئی اور ہی شے تھی جو اس کے لبوں کو تھرا رہی تھی۔ شاید اس لرزش کا نام ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا!

"چپ کیوں کھڑی ہو میری جان! کچھ بولو نا؟" اس نے جھگی کی حالتِ زار پر ایک سرسری نظر ڈال کر کہا۔ جھگی از خود ایک غربت کدے کا نام ہے۔ اس کا تصوّر آتے ہی نظروں کے سامنے ایک ایسی شے گھوم جاتی ہے جو مرغیوں کے ڈربے کی مماثل ہو۔ جو مرجھائے ہوئے

چہروں اور میلے کچیلے کپڑوں میں سسکتے ہوئے انسانوں کا بسیرا ہو۔ مگر اس وقت تو اس کی جھگی بھی دوسری جھگیوں کا تصوّر کر کے شرما رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی کباڑی کی دکان ہو یا میونسپل کارپوریشن کے قائم کردہ کچرے گھروں کی ساری غلاظت سمیٹ کر یہاں ڈال دی گئی ہو۔

"کیا بولوں؟" وہ ہولے سے بولی۔

"کچھ بھی کہو مگر بات ضرور کرو۔ خاموشی بُرے خیالات کی ماں ہے۔ اگر کہنے کے لئے کچھ نہ ہو تو رونا شروع کردو۔" وہ خود اپنی بات پر ہنس دیا۔ اُس کی ہنسی کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی۔ بلکہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ ہنسی نہ تھی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے کسی دِق کے مریض کا سینہ انگلیوں سے بجایا جارہا ہو۔ وہ اس کے بالوں پر انگلیوں سے کنگھی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ سامنے، پیچھے، اِدھر اُدھر ــــــ ہر طرف جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ فوجیوں کی طرح ایک قطار میں نہ تھیں بلکہ مکینوں کی زندگیوں کی طرح بے ترتیب تھیں۔ اس محلہ میں کوئی ایسی شے نہ تھی جس کو دیکھ کر مفلسی کا روح فرسا احساس ہی معدوم ہو سکتا۔ تفریح کا کوئی سامان نہ تھا۔ ہر شے تباہی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی۔ راستے ناہموار تھے۔ لوگ بدحال تھے۔ گلیوں کی حالت برباد تھی۔ وہ یہ منظر روز ہی دیکھتا تھا۔ اس لئے وہ اس کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اس کو دیکھ کر اُس کے لبوں کے خم آلود کونوں پر مسکراہٹ نہ ابھر سکی۔ وہ تباہ حالی پر کیونکر طنز کر سکتا تھا جبکہ اس کی زندگی خود تباہی کی آغوش میں سسک رہی تھی اور اپنی زندگی کی ناگفتہ بہ حالت پر وہ چوٹ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت خیالوں کا اجتماع نہ تھا۔ تصوّرات کی پرچھائیاں نہ تھیں۔ بس اس کو اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ چل رہا ہے۔ آگے بڑھ رہا ہے۔ نکڑ کے نل پر وہ رُک گیا۔ یہ نل دن رات کھلا رہتا تھا۔ سب کے لئے صلائے عام تھا۔ مگر اس کے لئے لائن کی ضرورت تھی۔ اور اس وقت بھی لائن ہی تھی جو شروع میں تو تیر کی طرح سیدھی تھی مگر درمیان سے کمان کی طرح ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ نل دو تھے اور پانی لینے والے بے شمار۔ ایک انار سو بیمار والا حساب تھا۔ اور قریب ہی کچھ لوگ بالٹی لئے موقع کی تلاش میں

تھے کہ کسی کی آنکھ جھپکے تو وہ لائن کے آگے کھڑے ہو جائیں۔ اس نے یہ حال دیکھا اور چپ چاپ اُلٹے قدم واپس لوٹ آیا۔

"کیوں! آج منہ نہیں دھویا؟" بیوی نے اُس کو جلدی آتا دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے جلدی ہے اور نل پر غولِ بیابانی کھڑا ہے۔" پھر وہ ہنس دیا۔ نہ جانے ان دنوں اس کو کیا ہو گیا تھا۔ بات بات پر مسکرا دیتا۔ اور کبھی کبھی یوں ہی بے مقصد کھِل کھِلا کر ہنس دیتا۔

"کہاں جا رہے ہو آج؟"

"آج ——" وہ ہنسنے کے لئے ایک لمحہ رکا۔ "آج مجھے ایک انٹرویو میں جانا ہے۔"

"کچھ امید ——؟"

"خدا کی مرضی!" وہ بولا اور وہی ایک پتلون پہننے لگا جو اس کی نظر میں سب سے زیادہ بیش قیمت تھی۔ دو سال پہلے جب وہ برسرِ روزگار تھا تو اُس نے پچاس روپے گز کے حساب سے اس کا کپڑا خریدا تھا۔ مگر یہ پتلون اس کے لئے منحوس ہی ثابت ہوئی کیونکہ جس دن وہ بن ٹھن کر اس پتلون کو زیب تن کئے ہوئے آفس پہنچا تو اُس کو پتہ چلا کہ اس کو ملازمت سے چھٹی مل گئی ہے۔ مگر اُس دن بھی وہ گھبرایا نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اُداسی نہ تھی۔ بس وہ چپ چاپ ہی رہا تھا اور جب اُس کے ایک ساتھی نے اُس کو تسلّی کے دو لفظ کہے تھے تو مسکرا دیا تھا۔

ملازمت جانے کا اس کو زیادہ رنج نہ تھا۔ وہ عزمِ صمیم کا مالک تھا۔ اُس کے بازو میں طاقت تھی، دماغ میں فطانت کی روشنی تھی۔ اُس کو یقین تھا کہ وہ اس سے بہتر ملازمت حاصل کرے گا مگر اس کا یہ خواب حقیقت کی حدود کو نہ چھُو سکا۔ لمحات اس پر طنزیہ مسکرا کر آگے بڑھتے گئے۔ حالات نے اس کے راسخ عزم کا مذاق اڑایا۔ تھوڑی بہت رقم جو اس نے پس انداز کر رکھی تھی وہ پیٹ کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد قرض کا چکر چلنے لگا۔ جب وہ ملنا بند ہو گیا تو بیوی کے جہیز کی باری آئی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اندھیرے بڑھتے گئے اور وہ روشنی کی کرنوں کو حاصل کرنے کے لئے تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مارتا گیا۔ اب اس گھر کی ہر شے قرض کے بندھنوں میں جکڑ گئی تھی۔ صرف کباڑہ ہی رہ گیا تھا جو ایک بوجھ

بن کر اُس کے سینے پر مونگ دل رہا تھا ــــــ اب یہی ایک اچھی پتلون عہد پارینہ کی یادگار رہ گئی تھی۔ وہ اس کو اس روز پہنتا جب کہیں اس کو انٹرویو میں جانا ہوتا ــــ اور آج اس کو ایک پرائیویٹ فرم میں انٹرویو کے لئے پہنچنا تھا۔ ٹائپسٹ کی جگہ خالی تھی۔ شاید اس لئے اس پتلون کی قسمت آج پھر جاگ اٹھی تھی۔ مگر اس کو تو اس روز کا انتظار تھا جب اس کی تقدیر کا سویا دیوتا مسکراتا ہوا بیدار ہو جاتا۔ جب وہ تیار ہو کر باہر نکلنے لگا تو اس کی بیوی بولی۔

"کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"کھانا!" وہ حیرت سے بولا۔ کیا آج چولہا جلا ہے؟"

"رات کو منّے کے گھر سے کھانا آیا تھا"

"کس تقریب میں؟"

"اس کی دادی کا چہلم تھا نا کل ــــ"

"نہیں، میں خالی پیٹ ہی انٹرویو میں جاؤں گا۔ سنا ہے خالی پیٹ میں ذہن اچھی طرح کام کرتا ہے۔ آج اس بات کو آزماؤں گا" وہ ہنس پڑا۔

وہ جھگی سے نکل پڑا۔ دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی لوگ جھگیوں سے کام کے لئے اس طرح نکل پڑے تھے جس طرح برساتی مینڈک نالوں سے نکلتے ہیں! اس کا ذہن گزشتہ زمانے کے متعلق سوچنے لگا جب اس کا اپنا مکان تھا۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ مسرت گلے کا ہار تھی۔ مصیبت دور تھی۔ مگر حالات ــــ انہوں نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا مگر یہ مسکراہٹ ــــ یہ اب بھی اس کے لبوں پر ڈیرا ڈالے ہوئے تھی۔ کتنی بے غیرت مسکراہٹ تھی۔ اس کی زندگی کو لٹتا دیکھ کر بھی اس کے پاس ہی تھی حالانکہ برے وقت میں تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے۔ آپ ہی آپ مسکراتا ہوا وہ سڑک پر آگیا۔ بس اسٹاپ پر جمِ غفیر تھا۔ بسیں کھچا کھچ بھری ہوئی آ رہی تھیں اور لائن میں کھڑے ہوئے لوگوں کی آوازیں اور گالیاں سننے کے باوجود بغیر رکے چلی جا رہی تھیں۔ اس نے اپنی جیب کا جائزہ لیا کل ساڑھے تین روپے تھے اس نے سوچا کیوں نہ وہ بھی لائن میں کھڑا ہو جائے اور بس میں بیٹھ کر بغیر ٹکٹ آدھی مسافت

طے کرے۔ وہ آسانی سے یہ کر سکتا تھا۔ وہ صدر کی بس میں بیٹھ جاتا اور کنڈیکٹر کے ٹکٹ طلب کرنے پر یہ کہہ کر اتر جاتا کہ اس کو بندر روڈ جانا ہے۔ مگر اس نے اپنے اس خیال کا گلا گھونٹ دیا۔ جب تک بس آتی وہ بہ نفسِ نفیس آدھے سے زیادہ راستہ طے کر سکتا تھا۔

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں بڑھتا گیا۔ لمحہ بہ لمحہ منزل قریب آتی جا رہی تھی۔ مگر منزل پر پہنچنے کے بعد وہ منزل کے اجالوں کو نہ پاسکا۔ انٹرویو ہوا مگر اس کو حسب سابق ناکامی کا زہر زہر مار کرنا پڑا۔ ایک آسامی کے لئے پچیس آدمی تھے۔ جگہ میٹرک اور انٹر پاس ٹائپسٹ کے لئے تھی اور ایم اے پاس وہاں موجود تھے۔ وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہاں دال گلنی مشکل ہے۔ جب وہ بے نیل و مرام باہر نکلا تو اس وقت بھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے گنڈیریوں والے سے اس نے ۵ پیسوں کی گنڈیریاں لیں اور انہیں چوستے ہوئے اپنی بربادی کا جشن منایا۔ سڑک پر زندگی جواں تھی۔ راہگیروں کے چہروں پر زندگی کی چمک اور روشنی جھلملا رہی تھی۔ کوئی مسکرا رہا تھا۔ کوئی قہقہہ لگا رہا تھا۔ کوئی کشاں کشاں نہ جانے کس خیال میں مگن چلا جا رہا تھا اور کوئی اس طرح بگٹٹ دوڑتا ہوا، لوگوں کو دھکے دیتا ہوا چلا جا رہا تھا جیسے اپنی منزل پر جلد از جلد پہنچنے کا خواہاں ہو۔ مگر وہ —— نہ تو اس کی منزل تھی نہ کسی کو اس کا انتظار تھا۔ بس اس کا کام چلنا تھا اور وہ اس وقت اس کام میں مصروف تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی خیال نہ تھا۔ اس کے دل میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ اور نہ اس کے چہرے پر کسی احساس کا سایہ تھا۔ وہ اس طرح قدم اٹھا رہا تھا جیسے وہ کوئی چابی والا کھلونا ہو اور اس کھلونے میں چابی بھر دی گئی ہو۔

وہ اس وقت چونکا جب اُس کے کان عجیب و غریب آوازوں سے جھنجھنا اٹھے۔ وہ ہوش کی دنیا میں آگیا۔ اُس نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ لوگ بدحواسی اور افراتفری کے عالم میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ عورتیں اور بچے حلق پھاڑ کر چلّا رہے تھے۔ کوئی گر رہا تھا کوئی سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور سامنے پھیلی ہوئی جھگیوں کی قطاریں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو چکی تھیں، صرف چند جھونپڑیاں ہی بچ گئی تھیں اور اس وقت آگ کے بے رحم شعلے اُن کے قریب پہنچ گئے تھے۔ دو تین فائر بریگیڈز انہیں بچانے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔

نہ جانے کون سا محلہ تھا۔ وہ وہیں فٹ پاتھ پر کھڑا بلند ہوتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے قریب ہی جھگیوں سے برآمد شدہ ٹوٹا پھوٹا مال پڑا ہوا تھا۔ کئی بوسیدہ ٹرنک ——— بہت سی چارپائیاں زخمی حالت میں تھیں۔ کسی کا بان جل چکا تھا تو کسی کا پایہ ہی غائب تھا اور نہ جانے کیا کیا الم غلم! جھگیوں کے بہت سے زخمی مکین اپنے مال کی دیکھ بھال کر رہے تھے، عورتیں واویلا کر رہی تھیں۔

"میرا بچہ ——— میرا بچہ۔"

"میری بالیاں غائب ہو گئی ہیں۔"

"ارے کوئی میری بوڑھی ماں کو بچالے۔"

دفعتاً ایک انجانا شور اُٹھا۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں، سامنے دو پولیس کانسٹیبل ایک بوڑھے آدمی کو پیٹتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ اُس کے کپڑے پھٹ کر تار تار ہو چکے تھے۔ اس کے چہرے پر بدحواسی کے آثار تھے۔ تجسّس کی لہریں اس کے دل میں رقصاں ہو گئیں۔ اس نے قریب کھڑے ایک آدمی سے اس سلسلے میں دریافت کیا۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر بوڑھے کو صلواتوں سے نوازنے لگا۔ پھر بولا۔

"سالا! ایک کھاٹ چوری کرتا پکڑا گیا۔"

اور چند لمحے بیت گئے۔ فائر بریگیڈ والوں کی کوششوں نے چند جھگیوں کو بچالیا تھا۔ اب زخمیوں کو گنا جا رہا تھا۔ مرنے والوں کی صحیح تعداد معلوم کی جا رہی تھی۔ اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز پہنچ گئے تھے۔ تصویریں لی جا رہی تھیں۔ واقعات قلمبند کئے جا رہے تھے۔ شور اور واویلا ابھی تک جاری تھا۔ تماشائیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی ——— وہ نہ جانے کس جذبے کے تحت وہیں کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا پھر اس نے ایک پولیس وین کو قریب رکتے دیکھا۔ دروازہ کُھلا۔ دو کانسٹیبل اندر سے روٹیاں اور سالن کے بھرے ہوئے کٹورے نکالنے لگے۔ کھانے کو دیکھ کر اُسے احساس ہوا کہ وہ خود بھوکا ہے۔ سب کو روٹیاں بانٹی جا رہی تھیں۔ لوگ غم کو بھول کر پیٹ کی آگ بجھانے میں مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے آپ میں گُم تھا کہ ایک کانسٹیبل نے اُس سے پوچھا۔

"کیوں! تمہاری جھگی بھی جلی ہے؟"

"جی ہاں!" وہ فوراً آہستہ سے بولا۔

"لو یہ روٹیاں ــــــ اور یہ سالن۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ جھپٹ کر یہ چیزیں لے لیتا کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی گالیاں بکتا ہوا سامنے آگیا۔

"تم سالا جھوٹ بولتا ہے... تمہاری..."

"کیا بات ہے؟" کانسٹیبل نے گھور کر اس اجنبی کو دیکھا۔

"یہ اس محلہ کا نہیں ہے۔" اس نے گریبان سے اس کو پکڑ لیا۔ دو چار آدمی اور جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس کے دو چار کرارے ہاتھ رسید کر دیئے اور ساتھ ہی گالیاں بھی بکتے رہے۔

کلٹی ہو جاؤ یہاں سے ــــ ورنہ تمہاری ماں ــــــ"

اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ جلدی سے چلتا بنے۔ بھیڑ میں گم ہو جانے کے بعد وہ دنیا والوں کی گندی ذہنیت کا دل ہی دل میں ماتم کرنے لگا۔ اگر اس کا بھی بھلا ہو جاتا تو کسی کا کیا جاتا؟ مگر لوگ تو اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد بھی کسی کا بھلا نہیں چاہتے۔ دریں اثنا اس نے ایک کانسٹیبل کی آواز سنی جو ایک بوڑھی عورت سے کہہ رہا تھا۔

"ماں جی! غم نہ کرو تمہیں اس سے اچھی جگہ دی جائے گی اور دو تین روز تک باقاعدہ کھانا ملے گا اور کچھ نقد روپے بھی!" وہ آگے بڑھ گیا۔ اس وقت بھوک کے احساس نے اس کی حالت دگرگوں کر دی تھی۔ اس کے لئے چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں اور بار بار اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخیاں لہرانے لگتی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ گھر پہنچا۔

"کیا ہوا؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔ وہ غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر امید و کشمکش دست و گریباں تھے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اس کے لبوں پر وہی پرانی مسکراہٹ چمک اٹھی اور وہ چارپائی پر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ بھوک مر چکی تھی۔ اس وقت اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ خیالات کے ہیولے بن اور مٹ رہے تھے۔

ان خیالوں سے اُس کے چہرے پر عجیب و غریب تاثرات کے عکس تھر تھرا رہے تھے ـــــ کبھی وہ سیاہی مائل ہو جاتا اور کبھی کامل چاند کی طرح ایک دم جگمگانے لگتا۔ اس کی بیوی یہ سب دیکھ رہی تھی مگر مہرِ بہ لب ہی رہی اور اس کو خاموش ہی پڑا رہنے دیا۔ شام کا سرمئی اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا۔ جھگی میں کڑوے تیل کا چراغ روشن ہو گیا مگر اس کے استغراق و انہماک میں سرِ مو فرق نہ آیا۔ اب تو چراغ کی زرد روشنی میں اس کے چہرے کے خطوط اور قوسیں بھی اجنبی معلوم ہو رہے تھے۔

اور جب رات بڑی ہو گئی تو سناٹا ہر طرف پھیل گیا۔ جھگیوں میں جلتے ہوئے دیئوں کی روشنی لمحہ بہ لمحہ مدھم ہو گئی۔ محلّے کے مکین گہری نیند کی دنیا میں کھو گئے تو وہ ایک ڈبہ لے کر دبے پاؤں جھگی سے نکل گیا۔ اس وقت نہ اُسے دنیا کی خبر نہ تھی نہ اپنی حالت کا احساس! اس کی آنکھوں میں خیالی دنیا کی پرچھائیاں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ دِل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چہرہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔ اُس کے پیروں میں ارتعاش تھا مگر اس کے باوجود وہ چلتا گیا۔ جھگیوں کے اختتام پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا اور فضا میں عجیب سا خوفزدہ کر دینے والا طلسمی سناٹا بکھرا ہوا تھا۔ نل کے پاس کبھی کبھی مینڈک ٹرّانے لگتے تھے۔ اُس نے ہولے سے ڈبہ کا ڈھکن کھولا اور سارا تیل جھگی میں انڈیل دیا۔ اور جیب سے ماچس نکالی۔ اُس وقت اس کے ذہن کے وسیع پردے پر بے شمار روٹیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سالن کے کٹورے تھے۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اپنے دبے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے اُبھرتے ہوئے بھوک کے بے رحم احساس کو تھپک تھپک کر سُلا رہا ہو۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سوکھے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ شبنم کی بوند بن کر لرزنے لگی تھی۔ اس نے ماچس کی تیلی کو روشن کیا اور جھگی کو آگ لگا دی!!

میلی چاندنی

عزیز نے جز بز ہو کر کہا۔

"بڑا منحوس دن ہے کم بخت"۔

اور پھر اپنی تمام تر توجہ کھیل کی طرف منعطف کر دی۔ آج اس کی سُرخ سُرخ آنکھوں میں شدید غُصّہ کا زہریلا احساس جھنجھلاہٹ سے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سی ڈراؤنی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ بڑی بڑی بل کھا کر اوپر کی طرف اُٹھی ہوئی مونچھوں کی نوکیں ہلکے ہلکے تھرتھرا رہی تھیں اور کوہ شکنی کو بھی دندان شکن جواب دینے والا بھاری بھر کم جسم کانپ رہا تھا؛ نہ جانے صبح ہی صبح اس نے کس کم بخت کی صورت دیکھی تھی کہ بازی پر بازی ہارے جا رہا تھا۔ تین چار بازیوں میں اتنے ڈھیر سارے کڑکڑاتے نوٹوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا کہ اب اُس کا دل اندر کی طرف بیٹھنے لگا تھا جیسے بھنور کی گرفت میں آئی ہوئی ایک بے بس کشتی آہستہ آہستہ چکراتی ہوئی آخر ڈوبنے کو ہو۔ ایک بار جبکہ اُس کا حریفِ روسیاہ کالو شاہانہ انداز سے نوٹوں کے ڈھیر کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا تو اُس نے اس کے سیاہ بھدّے ہونٹوں پر ایک بے حد گندی استہزائیہ مسکراہٹ کو تھرکتے ہوئے پایا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"عزیز بھائی! ہر روز قسمت مہربان نہیں ہوتی! آج تو میں اپنی زندگی بھر کی ہاری ہوئی رقم تم سے وصول کروں گا ——— آج قسمت میرے اشاروں پر ناچ رہی ہے ——— اونھ"

اور اس لمحہ کا زہر قطرہ بہ قطرہ اچھل کر جب عزیز کے دل پر گرنے لگا تو اُس کا چہرہ بھٹی کے لوہے کی طرح سُرخ ہو گیا اور اُس کا جی چاہا کہ وہ کالو کو ایک ہی گھونسہ میں تحت الثریٰ کی سیر کرا دے

مگر اُس جوش کی حالت میں بھی وہ ہوش میں رہا۔ نازک حالات کی بنا پر اس کی طنزیہ مسکراہٹ قہرِ درویش برجان درویش کے مصداق برداشت کرگیا۔ ورنہ سامنے بیٹھے ہوئے تینوں جواریوں پر وہ بھاری پڑتا تھا۔ ان کی ساری پونجی چھین سکتا تھا اور ان کی گردن میں ہاتھ دے کر دھکے دیتے ہوئے اپنے کوارٹر سے باہر پھینک سکتا تھا اور وہ اس کے خلاف جوابی کارروائی تو دور کی بات دم مارنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ مگر عزیز جانتا تھا کہ اگر اُس نے ایسا کیا تو پھر شاید زندگی بھر وہ پتے پھینٹ نہیں سکتا۔ سارے جواری اس کا سوشل بائیکاٹ کردیں گے اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے اس کھیل کی لطافتوں سے محروم ہو جائے گا یہی کچھ سوچ کر اس نے اپنے پہاڑ توڑ جوش کے مُنہ میں لگام دے رکھی تھی !!

کھیل کا بازار گرم تھا۔ ہر بازی قیامت خیز تھی۔ ہر ہاتھ طوفانی تھا۔ اس فن کے چاروں ماہرین اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لارہے تھے۔ کسی کو ہوش نہ تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے ؟ کسی کو خبر نہ تھی کہ وقت کن منزلوں کی طرف دوڑا چلا جارہا ہے۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ اپنے حریفوں کو ہاتھ جھاڑ کر اُٹھنے پر مجبور کر دے۔ پتے پھینٹے جارہے تھے۔ پتے بانٹے جارہے تھے اور سرسراتے نوٹوں کی گردش جاری تھی۔ کبھی کبھی بوڈ کی رقم ڈالتے ہوئے کالو نرم نرم چرس بھری سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے کش چھوڑتا تو کمرے کی محبوس فضا میں چرس کی عجیب سی خوشبو کی لہریں اِدھر اُدھر چکر کاٹنے لگتیں اور تب عزیز بُرا سا منہ بنا کر پتے کی پشت پر کھڑی نیم عریاں حسین وجمیل دوشیزہ کی تصویر دیکھنے لگتا۔ مگر دوسرے پتے باز بڑی مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگتے۔ وہ اپنی ناک کے بھدے نتھنوں کو پھُلا پھُلا کر اس دھوئیں کو ناک کے راستے دماغ میں داخل کرنے کوشش کرتے تاکہ ذہن کی ساری گرہیں ایک ہی جھٹکے میں کھُل جائیں، سوچ کو نئی راہیں مل جائیں اور وہ جیتنے کی نئی تدبیروں کی اختراع کرسکیں۔ پھر ایسے میں اس کے قریب بیٹھا ہوا مستری رحیم للچائی ہوئی نگاہوں سے کالو کے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ دیکھ کر دبے لہجے میں کہتا۔

"اے کالو ! اپن کو بھی ایک کس لگانا مانگتا !"

"کمینو ! وقت ضائع نہ کرو کھیل کھیلو ——— " عزیز کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا

اور مستری رحیم سہم کر خوشامدانہ لہجہ میں کہتا:

عجیج بائی! کھیالات جرا پریسان ہوتے پڑے ہیں۔ بس ایک کس!! ارے کالو دے دینا پیارے" اور پھر ہاتھ جوڑنے لگتا تو مقبول کباڑی اپنی مخصوص ہنسی ہنس کر جھٹکے دار لہجے میں کالو سے کہتا۔

"ابے دے دیجو نا"

اور پھر ایک لمحہ کے لئے کھیل رُک جاتا اور مستری ایک بے حد طویل کش کھینچ کر تھکے ہوئے بھینسے کی طرح ہانپنے لگتا تو کالو چیخ کر ناراضگی کا اظہار کرتا۔

"ابے او کتے! ایک ہی کش میں ساری سگریٹ ختم کردی"

اور وہ اُچک کر سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیتا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے نوٹوں کے ڈھیر کو فاتحانہ نگاہوں سے دیکھ کر لبوں کے موٹے موٹے کونوں کو عجیب طرح سے تھرتھرانے لگتا۔ اور پھر بھاڑ سا منہ کھول کر جمائی لیتا تو عزیز کا دل احساسِ شکست کی آگ میں جل بھُن کر کباب ہو جاتا۔ وہ جلدی سے واسکٹ کی جیب سے پانوں کی ڈبیا نکالتا اور اس کا ڈھکنا کھول کر ایک پان نکال کر منہ میں رکھ لیتا۔ اور پھر بٹوے میں سے ڈھیر ساری چھالیہ اور تمباکو مُنہ میں انڈیل لیتا۔ جس کی وجہ سے اس کا ایک رخسار پھول کر کُپا ہو جاتا اور اس کی صورت کچھ اور دہشتناک ہو جاتی۔ وہ چند لمحے تک چلے بھُنے انداز میں یوں منہ چلاتا رہتا جیسے اپنے بدترین دشمن کا دل چبا رہا ہو۔ اور پھر زور سے ایک پچکاری دیوار پر مارتا۔ سُرخ رنگ کا تھوک دیوار پر تجریدی آرٹ کی ایک شاندار پینٹنگ بنا دیتا۔ پان کا لعاب منہ میں گھولتے ہوئے اسے آسودگی و طمانیت کا احساس ہوتا اور وہ خود کو دنیا کا سب سے زیادہ مطمئن آدمی سمجھتا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اتنی رقم ہار جانے کا خیال پٹاخے کی طرح اس کے ذہن میں پھٹ پڑتا۔ شعلوں کی سیج پر اس کا دل لوٹنے لگتا اور کھیل دوبارہ شروع ہونے کے باوجود وہ انہیں تکلیف دہ خیالوں سے دست و گریباں رہتا جن کی موجودگی میں وہ چوٹ پر چوٹ کھائے جا رہا تھا۔

کھیل زوروں پر تھا۔ وہ سب ایسے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے جیسے ان کی شکست انہیں موت سے ہمکنار کر دے گی۔ ان کے نزدیک حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ہر بازی جیت لی

جائے۔ سب کھیل میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ دنیا تو بہت دور ـــــ کمرے کے ماحول سے بھی بیگانہ تھے۔ کمرہ بہت ہی سرد اور پرانی لال ٹین کی بے بضاعت روشنی سے نیم روشن تھا۔ در و دیوار سیلن اور سیلن کی آغوش میں بسی سڑاند سے مملو تھے جو اس وقت چرس کے دھوئیں کی بُو سے بغلگیر ہو کر ایک اجنبی سی غیر مانوس بدبو کو جنم دے رہی تھی۔ مگر مصروفیت کی وجہ سے شاید انہیں اس بدبو کا احساس ہی نہ تھا۔

کالو اپنی کامیابی پر سرشار و مست تھا۔ مستری رحیم اور مقبول کباڑی برابر تھے مگر اپنی رقم میں اضافہ کے خواہشمند تھے۔ ان کے ذہن نئی نئی تدبیریں سوچ رہے تھے مگر عزیز کی حالت دگرگوں تھی۔ غُصہ کی شدّت نے اس کے چہرے کو چقندر بنا دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اتنی رقم گنوا بیٹھا تھا۔ اسے اپنی ہار پر افسوس بھی تھا اور حیرت بھی! وہ اس فن کا استادِ اعظم تھا اور بقول اس کے، اس کو ہرانے والا ہنوز عالمِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ مگر آج ـــــ آج تو جیسے اس کی قسمت کسی گندگی کے ڈھیر کے پاس سہم کر بیٹھ گئی تھی۔ ہر ہاتھ پر وہ تاسف اور غصہ سے ہاتھ ملنے لگتا تھا اور سوچتا کہ اگر ہارنے کی یہی رفتار رہی تو شاید کچھ دیر بعد اس کو اپنا کمرہ بھی تینوں میں سے ایک کے حوالے کر کے سڑکوں کی خاک چھاننی پڑے گی۔ برسوں کی ریاضت اور محنت پر جیسے پانی پھر گیا تھا۔ وہ خود اپنی نظروں میں ایک اناڑی اور مبتدی بن کر رہ گیا تھا۔ آخر وہ کیوں ہار رہا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ کھیل کے دوران مستقل سوچے جا رہا تھا مگر اپنی شکست کا کوئی منطقی جواز اس کی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ کتنی شرمناک بات تھی کہ وہ ان لوگوں سے ہارے جا رہا تھا جو ببانگِ دُہل اُس کو اپنا استاد تسلیم کر چکے تھے۔ جو نہ جانے کتنی بار اپنی ایک ایک پائی اس کے حوالے کر کے کپڑے جھاڑتے ہوئے اُس کمرے سے نکل چکے تھے مگر آج ـــــ آج تو جیسے اُس کی قسمت نے تہیہ کر لیا تھا کہ تینوں کی سابقہ شکستوں میں ہاری ہوئی ایک ایک پائی عزیز کی جیب سے ادا کر کے ہی رہے گی۔

کھیل جاری تھا۔ ہار جیت کے فیصلے ہو رہے تھے۔ نوٹ سرسرا رہے تھے مگر عزیز اپنی ہی آگ میں سلگ رہا تھا۔ اور اپنی ہار کی حقیقی وجہ دریافت کرنے کے لئے وہ سوچ کی اجاڑ وادیوں میں نکل پڑا تھا۔ جہاں ہر قدم پر اُلجھنیں کانٹوں کا روپ دھارے بیٹھی تھیں۔ اس نے سوچا

اُس نے صبح سے کوئی ایسا غلط قدم نہیں اٹھایا ہے کہ اللہ میاں اس سے ناراض ہوں۔ اُس نے حسبِ معمول خشوع و خضوع کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز ادا کی تھی اور ہمیشہ کی طرح عشاء کی نماز کے بعد ہی توبہ استغفار کر کے کھیل کی ابتدا کی تھی اور پچھلی جمعرات کو اس نے عقیدت و احترام سے چپ شاہ کے مزار پر حاضری دی اور پھولوں کی چادر چڑھائی تھی ـــــ اور جمعہ کو ـــــ ہاں جمعہ کو بھی ہمیشہ کی طرح اُس نے ایک ایک روپے کے دس نوٹ خیرات کئے تھے ـــــ پھر ـــــ اوہ ہاں وہ پان اور تمباکو بھی باقاعدگی سے کھا رہا ہے پھر ـــــ پھر ہارنے کی کیا وجہ ہے؟ پھر آخر قسمت اس سے کیوں ناراض ہوگئی ہے؟

وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا اور پھر اچانک اس بُری طرح اچھلا کہ اُس کے تینوں ساتھیوں کے ہاتھ سے پتے گر پڑے۔ سب کے چہرے ہلدی کی طرح پیلے پڑ گئے۔ عزیز شعلوں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھوں سے کالو کو ایک لمحہ تک یوں گھورتا رہا کہ وہ بیچارا کپکپا کر رہ گیا۔

"کمینے! ذلیل! کتا!" وہ دھاڑتا ہوا اس پر کسی خونخوار درندے کی طرح ٹوٹ پڑا اور اس بیدردی سے اس کے نیچے سے جانماز کو گھسیٹا کہ وہ پُشت کے بل گرتے گرتے بچا۔ اب وہ بیچارگی اور خوف سے عزیز کو دیکھ رہا تھا۔

"کمینے کے بچے! اس پر بیٹھا تھا؟" وہ جانماز کی طرف اشارہ کر کے زہریلے لہجے میں بولا۔ "کمینے! ذلیل! دغاباز! اس پر بیٹھ کر میں اللہ کو یاد کرتا ہوں۔ تو نے اس کو ناپاک کر دیا۔ اللہ میاں مجھ سے اسی لئے خفا ہو گئے تھے۔ جب ہی تو میں مسلسل ہار رہا ہوں ورنہ تم ـــــ تم ـــــ تم ـــــ تم ـــــ سب مل کر بھی مجھ کو نہیں ہرا سکتے! کتو!"

عزیز نے انتہائی عقیدت و احترام سے جانماز کو تہہ کیا اور ایک صاف ستھرے کپڑے پر رکھ دیا۔ کالو، مقبول اور رحیم تینوں پتھر کی طرح چپ تھے۔ جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ گڑبڑا کر اس وقت چونکے جب عزیز کی گرجدار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اب کھیل شروع کرو۔ اب میں تم کو دیکھتا ہوں۔"

عزیز کے چہرے پر طمانیت بیدار ہو گئی تھی اور وہ آنے والی کامیابی کے نشہ سے سرشار ہو کر کھیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔
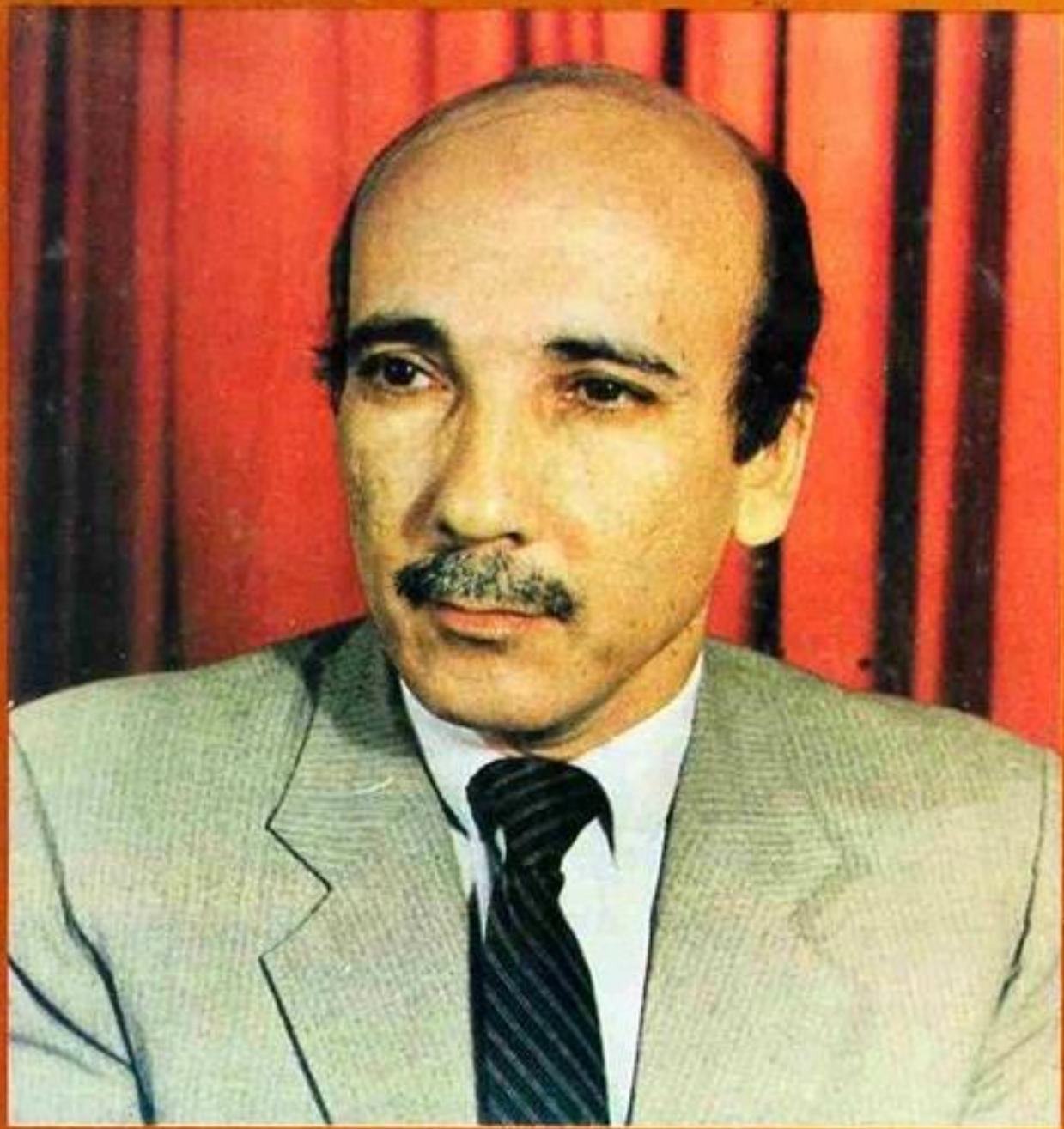
خاندانی نام سید محمد ناصر ہے مگر ادبی حلقوں میں ناصر بغدادی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ حسباً و نسباً حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے بزرگ عراق کے جید علما میں شمار کیے جاتے تھے۔ جدِ محترم اس صدی کی دوسری دہائی میں نظام دکن کی دعوت پر حیدرآباد دکن تشریف لائے اور تا عمر مذہب کی اشاعت اور رشد و ہدایت کے کارِ عظیم میں مشغول رہے۔ ناصر بغدادی کا جائے تولد بھی سرزمینِ دکن ہے۔ وہ ۱۵ فروری ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا مگر والدہ کی مثالی محبت جسارت و عظمت نے اولاد کو کبھی یتیمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ قیامِ پاکستان کے چند برسوں بعد اُن کا خاندان پاکستان آ گیا اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ناصر بغدادی نے میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ کالج کے زمانہ طالب علمی میں انہیں محمد حسن عسکری کی قربت نصیب ہوئی جس نے آگے چل کر شاگرد اور استاد کے درمیان دوستی کے نہ ختم ہونے والے باہمی رشتے کو جنم دیا۔ عسکری صاحب کے علمی تبحر، ادبی اجتہاد اور تحقیقی نظامِ فکر نے ناصر بغدادی کو بے پایاں متاثر کیا۔ افکار و آرا کے اختلاف کے باوصف وہ عسکری صاحب کے فیضِ نظر سے مستفیض ہوتے رہے۔

ناصر بغدادی نے معاشیات میں ایم اے کی ڈگریاں کراچی یونیورسٹی، لیک ہیڈ یونیورسٹی (کینیڈا) اور یونیورسٹی آف اوریگن (امریکہ) سے حاصل کیں۔ میک گل یونیورسٹی (مانٹریال) سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کا امتحان پاس کیا مگر بعض امور میں اکنامکس ڈیپارٹمنٹ سے اختلاف کے باعث اور چند دیگر وجوہ کی بنا پر وہ ڈاکٹریٹ مکمل نہ کر سکے۔

شمالی امریکہ روانگی سے قبل ناصر بغدادی نے عسکری صاحب کی خواہش پر اسلامیہ کالج کراچی میں دو سال تک لیکچرر کی حیثیت سے معاشیات پڑھائی۔ اُن دنوں عسکری صاحب اسی کالج میں شعبۂ انگریزی کے صدر تھے۔ شمالی امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ناصر بغدادی تین سال تک نائجیریا میں وفاقی وزارتِ تعلیم سے منسلک رہے اور وہاں ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں شعبۂ معاشیات کے صدر کی حیثیت سے کام کیا ——— چودہ سال تک غریب الوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد وہ ۱۹۸۴ء میں وطن لوٹے اور تب سے نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔